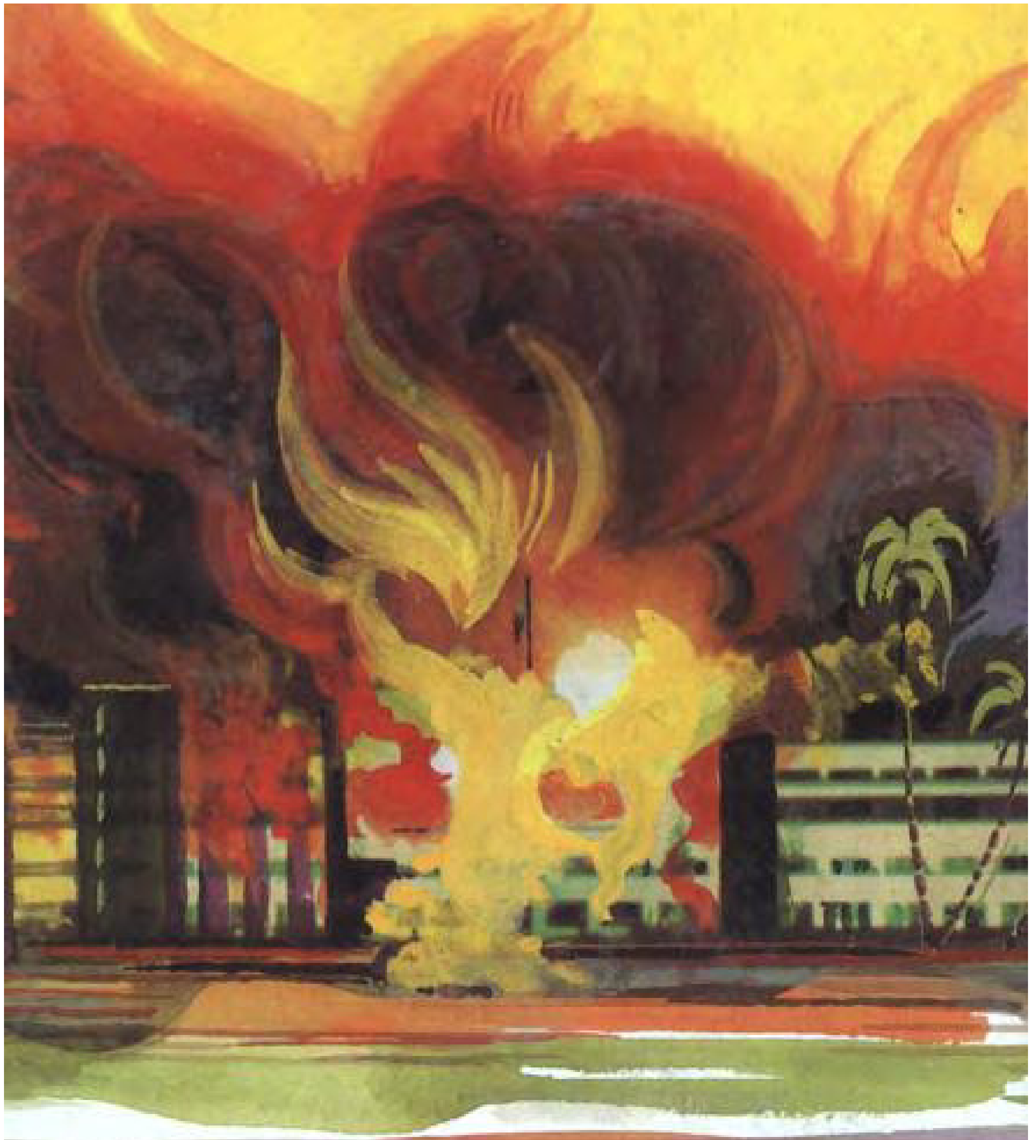

جب ڈھاکہ جل رہا تھا

اے حمید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

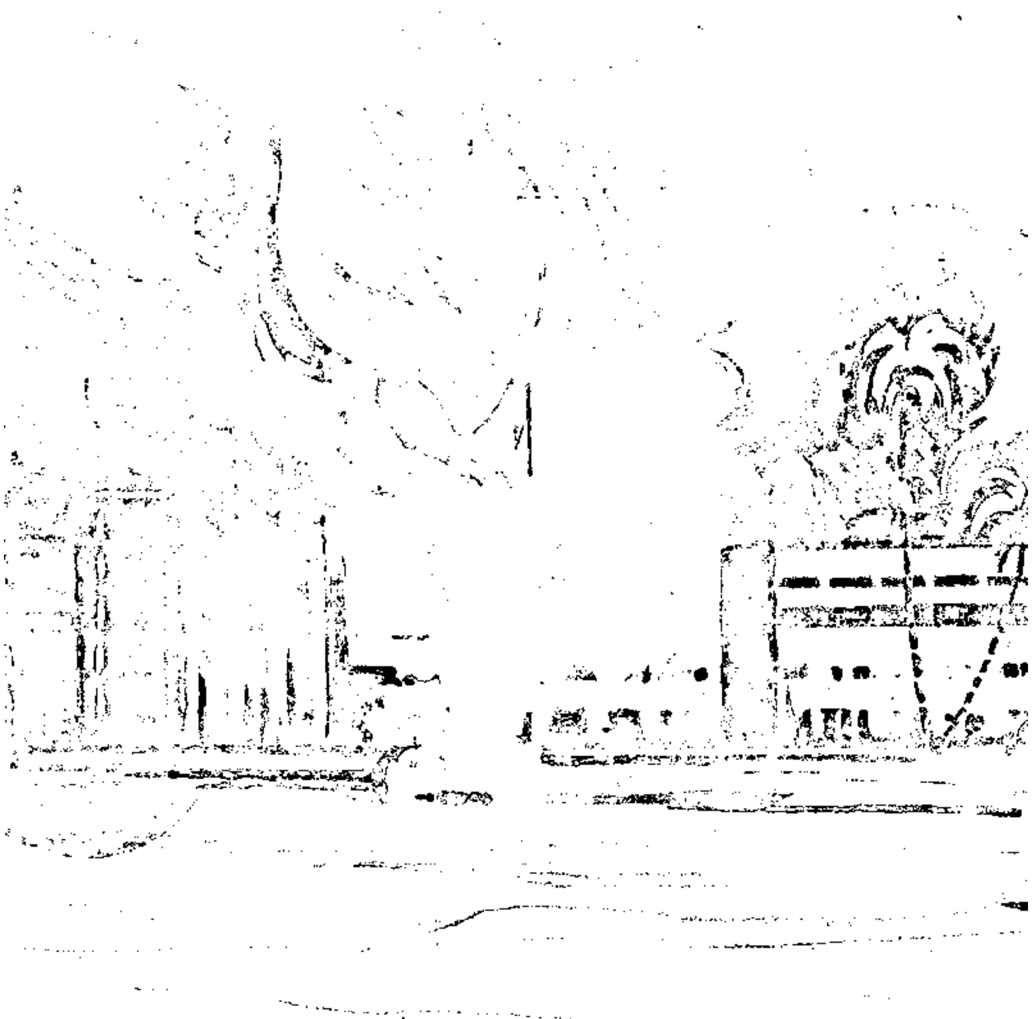

جب ڈھاکہ جل رہا تھا

اے حمید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈھاکہ جل رہا تھا اور میں ڈھاکہ جا رہا تھا۔

یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ وہاں کے حالات خراب ضرور تھے۔ اخباروں میں اس قسم کی خبریں چھپتی تھیں کہ بھارت نے اپنی کمانڈو فورس اور مکتی باہنی کے لوگ مشرقی پاکستان میں داخل کر دیے ہیں جو ہندو ہیں اور مشرقی پاکستان کے ہندو بنگالیوں کے ساتھ مل کر غیر بنگالیوں پر حملے کر رہے ہیں اور ان کے گھروں کو لوٹ کر آگ لگا رہے ہیں۔ لیکن آخر وہ پاکستان کا حصہ تھا اور میں کسی دشمن ملک میں نہیں' اپنے ملک میں جا رہا تھا۔ دل میں تھوڑی بہت تشویش ضرور تھی مگر یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہاں کے حالات بہت جلد معمول پر آجائیں گے۔ سیاست دان جو گھناؤنا کھیل کھیل رہے تھے' وہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

ہمارا ایک کزن شاہد بٹ اپنے بھائی فیاض بٹ کے ساتھ ڈھاکے میں قالینوں کا کاروبار کرتا تھا۔ دونوں بھائی ڈھاکہ کے علاقہ محمد پور میں اگرچہ محفوظ تھے مگر لاہور میں ان کے دوسرے بھائی مشرقی پاکستان کے حالات سن سن کر پریشان ہو رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں بھائی کسی طرح اس علاقے سے نکل کر ڈھاکہ چھاؤنی میں چلے جائیں۔ بقول ان کے ایسا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ ڈھاکہ چھاؤنی میں مقیم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاک فوج کی کسی یونٹ کا کوئی افسر اپنی فوجی گاڑی لے کر علاقہ محمد پور میں جائے اور دونوں بھائیوں کو وہاں سے نکال کر اپنے پاس چھاؤنی لے جائے۔ چونکہ میرا ایک قریبی عزیز جو فوج میں کرنل تھا اور اپنی آرٹلری کی رجمنٹ کے ساتھ ڈھاکہ چھاؤنی میں رہ رہا تھا' اس لئے میرا فرض بنتا تھا کہ میں ڈھاکہ جاؤں اور دونوں بھائیوں کو محمد پور کے علاقے سے نکال کر چھاؤنی میں پہنچا کر واپس آجاؤں اور اگر دونوں بھائی راضی ہو جائیں تو انہیں بھی اپنے ساتھ لاہور واپس لے آؤں۔

لاہور سے ڈھاکہ کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ میرے لئے منگوا لیا گیا۔ اس وقت انڈیا کی حکومت نے پاکستانی ہوائی جہازوں کی اپنے ملک کے اوپر پرواز کرنے پر پابندی لگا دی تھی اور پی آئی اے کے جہاز کراچی سے براستہ کولمبو (سری لنکا)' ڈھاکہ جاتے تھے۔ میں لاہور سے کراچی پہنچا اور کراچی سے ڈھاکہ جانے والے طیارے میں سوار ہو گیا۔ جہاز نے ٹیک آف کیا اور سری لنکا کی پرواز شروع کر دی۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ یہ کتنی دیر کی پرواز تھی۔ سری لنکا کا دارالحکومت کولمبو قریب آیا تو جہاز نیچے اترنے لگا۔ مجھے سمندر کے کنارے ماؤنٹ لیونیا کلب کی عمارت نظر آئی۔ جن دنوں میرا قیام کولمبو میں تھا تو میں کبھی کبھی اپنے کسی دوست کے ساتھ اس کلب کی ٹیرس پر بیٹھ کر چائے پیا کرتا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آگئے۔ طیارہ ایک طرف سے چکر لگا کر کولمبو ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

ابھی تک مجھے حالات کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ جہاز میں بنگالی اپنے کنبوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ مگر وہ لوگ مجھے بالکل پاکستانی اور نارمل لگ رہے تھے۔ ان بنگالیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مجھے ان سے کسی قسم کا معمولی سا خطرہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میرے پاکستانی بنگالی بھائی تھے۔ خطرے کا سوال ہی میرے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ جہاز کچھ دیر کولمبو ایئرپورٹ پر رکنے کے بعد ڈھاکہ کی جانب پرواز کر گیا۔

قیام پاکستان کے بعد میں صرف ایک بار مشرقی پاکستان گیا تھا۔ اب دوسری بار جا رہا تھا۔ ایک بات میں نے اب آکر خاص طور پر محسوس کی تھی کہ جہاز میں زیادہ تر مسافر بنگالی تھے۔ ان میں مجھے کوئی پنجابی یا صوبہ سرحد کا مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بڑے اطمینان سے کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ شروع ستمبر کے دن تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ جہاز خلیج بنگال کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ نیچے سوائے سمندر کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب ڈھاکہ قریب آیا تو سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آنے لگے۔ جہاز کی بلندی کم ہوتی گئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ جہاز ڈھاکہ ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

میرے پاس حسب عادت کوئی سامان نہیں تھا۔ صرف چمڑے کا ایک بریف کیس تھا جس میں شیونگ کا سامان اور ایک پتلون اور قمیص تھی۔ مسافر قطار بنا کر جہاز کے دروازے کی طرف چلنے لگے۔ جب میں جہاز کے دروازے میں سے نکل کر سیڑھیاں اتر رہا تھا تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے ماحول کا سرسری نظر سے جائزہ لیا تو مجھے وہاں ایک طرح کی ویرانی سی چھائی ہوئی معلوم ہوئی۔ ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اکثر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کوئی بنگالی سیکورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ میں عمارت کے باہر آیا تو ایک ایسا منظر دیکھا جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر لوگ ہجوم کی شکل میں اپنے بال بچوں کے ساتھ سامان لئے بیٹھے تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء کا منظر یاد آگیا جب مسلمان مہاجرین ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارموں پر جانیں بچا کر جمع ہو جاتے تھے۔

تب مجھے احساس ہوا کہ مشرقی پاکستان کے حالات وہ نہیں ہیں جو میں نے سمجھے ہوئے تھے۔ اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے یہ لوگ سارے کے سارے پنجابی اور پٹھان تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ لوگ یہاں اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟"

اس شخص نے حیرانی کے عالم میں میری طرف دیکھا اور ہنس دیا:

"بھائی صاحب! آپ کہاں سے آرہے ہیں۔۔۔ کیا آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ مشرقی پاکستان میں کیا قیامت مچی ہوئی ہے؟"

میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ ڈھاکہ ائر پورٹ سے نکلتے ہی بائیں جانب ہو جائیں تو وہ سڑک آجاتی ہے جو چھاؤنی میں داخل ہوتی ہے۔ میرا رشتے دار کرنل ڈھاکہ چھاؤنی میں ہی رہتا تھا اور مجھے اسی کے پاس جانا تھا۔ میں پیدل ہی چھاؤنی والی سڑک پر آگیا۔ سڑک ویران پڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے چھاؤنی کا علاقہ شروع ہوتا تھا' وہاں فوج نے رکاوٹ کھڑی کر کے سڑک بند کی ہوئی تھی۔ شہر سے کوئی گاڑی چھاؤنی کی طرف جانے والی آتی تو اسکی چیکنگ کے بعد بانس اٹھا کر اسے آگے جانے کی اجازت دی جاتی۔ اس چیکنگ پوسٹ کی دونوں جانب پاک فوج کے جوان ڈیوٹی پر موجود تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا چیکنگ پوسٹ پر آگیا۔ دو فوجی جوان سڑک سے ہٹ کر لکڑی کے کھوکھوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور پنجابی میں کہا کہ فلاں کرنل صاحب کے گھر جانا ہے۔ دونوں فوجی پنجاب رجمنٹ کے جوان تھے۔ ان کے چہرے بڑے سنجیدہ تھے۔ ایک فوجی جوان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ مجھے پنجابی میں بات کرتے دیکھ کر اس نے پنجابی میں پوچھا۔

"تساں کتھوں آئے او۔" (آپ کہاں سے آئے ہیں؟)

میں نے کہا۔ "لاہور سے۔"

دونوں یوں ایکدم چونک پڑے جیسے میں نے کوئی ایسی بات کہہ ڈالی جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی۔ ایک جوان نے میری طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کیا لینے آگئے ہو؟"

اسکا یہ جملہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں نے کہا:

"میرے ایک بھائی محمد پور میں ہیں۔ انہیں وہاں سے نکال کر چھاؤنی پہنچانے آیا ہوں۔"

دونوں جوان مجھے افسوسناک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"یہاں بیٹھیں۔"

میں قریب ہی خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک فوجی جوان لانس نائیک تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا:

"کیا لاہور والوں کو علم ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"کچھ کچھ معلوم ہے۔ اخباروں میں خبریں آتی رہتی ہیں۔"

دوسرے جوان نے کہا:

"آپ یہاں بیٹھیں۔ ابھی آپ کو دکھاتے ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

میں دل میں پریشان اور کسی حد تک خوف زدہ بھی ہو گیا تھا کہ خدا جانے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ائر پورٹ پر میں نے غیر بنگالی پاکستانیوں کا جو ہجوم اور ان لوگوں کو بے سروسامانی کے عالم میں پڑے ہوئے دیکھا تھا' میرا ماتھا وہیں ٹھنکا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اب فوج کے جوانوں سے باتیں سنیں تو دل میں تشویش سی لگ گئی' نہ خدا خیر کرے۔ اتنے میں شہر کی طرف سے ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی گاڑی آکر چیکنگ پوسٹ پر رکی۔ لانس نائیک نے کہا:

"میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گاڑی پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا تھا۔ چیکنگ پوسٹ کے جوان گاڑی کی طرف بڑھے۔ ایک نے بنگلہ دیش کا جھنڈا اتار دیا۔ دوسرا گاڑی میں جھک کر باتیں کرنے لگا۔ مجھے جو فوجی جوان وہاں تک ساتھ لے گیا تھا' وہ بھی گاڑی کی تلاشی لینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک جوان لڑکی ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پتے کی طرح پیلا تھا۔ چہرے پر جلن کے گول گول نشان تھے جن پر جلا ہوا خون جم گیا تھا۔ اسکی حالت سخت غیر تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی۔ قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لڑکی پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اور اس نے اپنا سر بوڑھے آدمی کے کاندھے پر رکھا ہوا تھا۔ بوڑھے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

"یہ میری بیٹی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ایک فوجی جوان گاڑی میں آگے بیٹھ گیا اور گاڑی چھاؤنی کی طرف چل دی۔ میرے ساتھ جو فوجی لانس نائیک تھا' اس وقت اس کی آنکھوں میں مجھے خون اترا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا:

"میں اتنا ہی کہوں گا کہ یہ پنجابی لڑکی تھی۔ ساتھ اسکا بدنصیب باپ بیٹھا ہوا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ مکتی باہنی کے ہندو اور پاکستان دشمن بنگالیوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا ہے' اسکا تم نے لڑکی کے چہرے سے اندازہ لگا لیا ہوگا۔۔۔"

میں لانس نائیک کے ساتھ واپس کھوکھے پر آکر بیٹھ گیا۔ پاک فوج کے اس غیرت مند لانس نائیک کی آنکھوں میں خون کی سرخی تھی۔ کہنے لگا:

"دن میں اس قسم کی نہ جانے کتنی غیر بنگالی مسلمان لڑکیوں کو چھاؤنی لایا جاتا ہے۔ ہمارا ایک جوان ساتھ جاتا ہے اور بچی کو سی ایم ایچ میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچا کر واپس آجاتا ہے۔ لاہور والے اخباروں کی خبریں پڑھتے ہیں۔ اخبار والے سارا جھوٹ

بکواس لکھ رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان غیر بنگالی مسلمانوں کا جہنم بن چکا ہے۔ ہمیں بھی حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ چھاؤنی کی حدود سے باہر نہیں نکلو گے۔ ہم حکم کے پابند ہیں۔ فوجی ڈسپلن کے تحت ہمیں افسروں کا ہر حکم ماننا ہوتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ دیکھتے ہیں تو ہمارا خون کھول اٹھتا ہے۔ ہماری ماؤں بہنوں کی عزتیں خراب کی جارہی ہیں مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔۔ تم پنجابی سویلین ہو۔ شہر میں جاؤ گے تو بنگالی پہلے چوک میں ہی چھرا مار کر تمہیں ہلاک کر دیں گے۔"

وہ اسی قسم کی باتیں کرتا رہا اور میں سوچنے لگا کہ واقعی میں اس مرتبہ موت کے منہ میں آگیا ہوں۔ میں نے اس سے اپنے کزن کرنل کے گھر کے بارے میں ایک بار پھر پوچھا تو وہ بولا:

"چھاؤنی میں بہت سے کرنل ہیں۔ آپ کے کرنل کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے؟"

"وہ آرٹلری میں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

لانس نائیک نے کہا: "چھاؤنی میں چلے جائیں۔ تھوڑی دور آگے جاکر فوجی افسروں کے کوارٹر شروع ہوجاتے ہیں۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا۔"

میں پاک فوج کے جوان کو سلام کرکے اٹھا اور چھاؤنی کی سڑک کے کنارے کنارے چل پڑا۔ میری آنکھوں میں بار بار اس لڑکی کا چہرہ آجاتا تھا جو بنگالیوں کی درندگی کا شکار ہوئی تھی۔ پوچھتے پوچھتے میں اپنے کزن کرنل صاحب کے کوارٹر میں پہنچ گیا۔

انہوں نے مجھے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ حیرانی سے پوچھا:

"تم یہاں کہاں؟"

میں نے کہا: "اندر چل کر بتاتا ہوں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ پھر میں نے کرنل صاحب کو ساری بات بیان کر دی کہ میں اس وجہ سے آیا ہوں اور مجھے مغربی پاکستان میں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کیا قیامت برپا ہو چکی ہے۔ وہ کہنے لگے:

"تم نے سخت غلطی بلکہ حماقت کی کہ یہاں آگئے ہو۔ جہاں تک ان لوگوں کو محمد پورہ سے چھاؤنی لانے کا تعلق ہے تو ہمارے لئے ڈھاکہ شہر آؤٹ آف باؤنڈ ہے۔ مجھے شہر میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔۔۔۔"

وہ بار بار سر کو ہلکا سا جھٹک کر مجھے کہتے:

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ تم نے سخت حماقت سے کام لیا ہے۔ تمہیں وہاں کسی نے نہیں بتایا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا: "یہاں جو کچھ ہو رہا ہے' اس کے متعلق وہاں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے بھی قیامت کا منظر یہاں آکر ہی دیکھا ہے۔"

پھر میں نے انہیں کار میں نیم بے ہوش غیر بنگالی لڑکی اور اس کے باپ کا واقعہ سنایا۔ کرنل صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا:

"یہ سب کچھ مکتی باہنی فورس کے ہندو کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ یہاں کے کچھ مسلمان سادہ لوح گمراہ بنگالی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ مکتی باہنی کے ہندو غنڈے بھارت نے یہاں سمگل کئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ہر شہر میں غیر بنگالیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ان کی عورتوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد اس طرح ہلاک کیا جاتا ہے کہ ان کے ایک ایک عضو کاٹا جاتا ہے۔ بچوں کو سنگینوں والی رائفلوں پر اچھال کر پرو دیا جاتا ہے۔ مسمان مسلمان کے ساتھ ایسا درندوں والا سلوک کرے گا' اس کا کبھی ہم نے سوچا تک نہیں تھا۔ شہر سے ہماری سپلائی کٹ گئی ہے۔ چھاؤنی میں جو بنگالی دو کاندار ہمیں سبزی گوشت سپلائی کرتے تھے' وہ چھاؤنی سے شہر بھاگ گئے ہیں۔۔۔۔"

کرنل صاحب خاموش ہو گئے۔ کمرے میں اذیت ناک سکوت چھا گیا۔ پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں محمد پورہ نہ خود جا سکتا ہوں' نہ فوجی گاڑی بھیج کر شاہد بٹ اور فیاض بٹ کو وہاں سے نکلوا سکتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا کہ ائرپورٹ سے سیدھا میرے پاس آگئے۔ شہر کا رخ نہیں کیا۔"

رات میں دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ یہ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ دونوں بھائیوں کو ہر حالت میں محمد پورہ سے نکال کر چھاؤنی لے آؤں گا۔ محمد پورہ اور میرپور شہر ڈھاکہ کی دو غیر بنگالی بستیاں تھیں جہاں بہاری' پنجابی اور پٹھان لوگ اپنے کنبوں کے ساتھ آباد تھے۔ کرنل صاحب کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ مکتی باہنی نے ان بستیوں میں بھی غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر دیا ہے۔ اس سے مجھے سخت تشویش ہوئی۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ میں کرنل صاحب کو بتائے بغیر محمد پورہ کی طرف نکل جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد میں چھاؤنی میں سیر کرنے کے بہانے کرنل صاحب کے کوارٹر سے نکل آیا اور چھاؤنی کی چیک پوسٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہی سڑک چیک پوسٹ سے ہو کر ائرپورٹ کے پہلو سے گذرتی ہوئی ڈھاکہ شہر کی طرف چلی گئی تھی۔ ائرپورٹ پر آیا تو وہاں غیر بنگالی مہاجرین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ شہر کی طرف سے کبھی کبھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ میں شروع ہی سے ایڈونچر پسند اور انگریزی میں ڈیئر ڈیول تھا۔ طبیعت خطر پسند تھی۔ جب تک موت بالکل سامنے نہ آجائے' میں کبھی نہیں گھبراتا تھا۔ ائرپورٹ پر کچھ سائیکل رکشا کھڑے تھے۔ یہ رکشا والے بنگالی تھے۔ میں بنگلہ نہ بول

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکتا تھا' نہ سمجھ سکتا تھا۔ بنگالی کا کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔ میں نے ایک رکشا والے سے کہا:۔

"محمد پورہ چلے گا۔؟"

"چلے گا بابو؟"

میں سوچے سمجھے بغیر کہ یہ کیا کر رہا ہوں' رکشے میں بیٹھ گیا۔ رکشا سڑک پر چل پڑا۔ جیسے جیسے میں شہر میں داخل ہو رہا تھا' سڑکیں سنسان ہو رہی تھیں۔ بنگالیوں کا ایک چھوٹا سا جلوس لمبے لمبے بانس اٹھائے بنگلہ زبان میں کوئی نعرے لگاتا سڑک پر سے گذر گیا۔ رکشا والے نے رکشا ایک طرف کھڑا کر لیا تھا۔ جلوس گذر گیا تو رکشا آگے روانہ ہوا۔ آگے چوک میں کچھ لوگ کھڑے ایک کار کی تلاشی لے رہے تھے۔ یہ کار محمد پور والی سڑک کی طرف سے آئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ بنگالی یا مکتی باہنی والے بنگالی ہر اس گاڑی کی تلاشی لے کر اسکا قیمتی سامان اپنے پاس رکھ لیتے ہیں جو شہر سے چھاؤنی کی طرف جا رہی ہوتی ہے اور جس میں پنجابی' بہاری یا پٹھان سوار ہوں۔ بعض بہاری مدت سے ڈھاکے میں آباد تھے۔ بعض اسی مٹی میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ وہ بڑی روانی سے بنگالی بولتے تھے مگر بنگالی لوگ ان کے لہجے سے پہچان لیتے تھے کہ یہ بہاری ہے اور اسے قتل کر دیتے تھے۔

ہمارے رکشے کو بھی چوک میں روک لیا گیا۔ میرا رنگ کھلتا ہوا اور صاف تھا۔ کالا یا سانولا نہیں تھا۔ میں کسی پہلو سے بھی بنگالی نہیں لگتا تھا۔ مجھے بنگالی زبان بھی نہیں آتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ اپنی نادانی حماقت یا خطر پسند افتاد طبع کے باعث موت کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ ایک بنگالی نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ انگریزی بولنے کی شروع ہی سے مجھے کافی عادت پڑ گئی تھی۔ خطرے کا احساس مجھے ہو چکا تھا۔ میں نے انگریزی میں جواب دیا:

"میں ایرانی ہوں۔ محمد پورہ میں اپنے بھائی سے ملنے جا رہا ہوں۔۔۔"

دوسرے بنگالی بھی رکشے کے پاس آ گئے اور مجھے گھور کر دیکھنے لگے۔ ان میں سے دو بنگالیوں نے سٹین گنیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ مجھ سے سخت حماقت ہو گئی ہے۔ مگر اب سارا معاملہ میں نے اللہ کے سپرد کر دیا۔ ایک بنگالی نے پوچھا:

"کیا تم ایران سے آئے ہو؟"

میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا:

"ہاں۔ میں ایران کا رہنے والا ہوں۔ یہاں قالینوں کا کاروبار کرتا ہوں۔"

دوسرا بنگالی کہنے لگا:

"فارسی بول کر دکھاؤ۔"

فارسی زبان میں نے سکول میں پڑھی تھی۔ بعد میں ایک استاد سے بھی فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اچانک فارسی کا ایک شعر زبان پر آ گیا۔ یہ شعر لاہور میں میرے ایک دوست نے مجھے سنایا تھا جو یاد ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً شعر پڑھ دیا۔۔۔

ملال آدمیاں دم بہ دم دگرگوں است
منم کہ مدت عمرم بہ یک ملال گزشت

بنگالیوں نے میری زبان سے اوپر تلے فارسی کے اتنے زیادہ الفاظ سنے تو میری جان بخشی کر دی۔ سائیکل رکشا والا وہاں سے تیزی کے ساتھ رکشا نکال کر لے گیا۔ ذرا آگے جا کر کہنے لگا:

"بابو آپ پنجابی ہوتے تو ان لوگوں نے آپ کو مار دینا تھا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں چپ رہا۔ میرا دل موت کے منہ سے بچ نکلنے کے بعد تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بہت جلد اپنے اوپر قابو پالیا۔رکشا اس وقت ڈھاکہ کے زیر تعمیر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس کے بعد ایوب گیٹ آگیا۔یہاں سے محمد پور کی آبادی شروع ہوجاتی تھی۔ یہ آبادی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ مجھے لاہور میں میرے کزن بھائیوں کا جو ایڈریس بتایا گیا تھا' وہ یہ تھا کہ ان کا شوروم محمد پور میں میونسپل ہال کے بالکل سامنے ہے۔ میں میونسپل ہال کے آگے رکشے سے اتر گیا۔

سامنے دیکھا تو کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے مکانوں کی قطار تھی۔ میں ان مکانوں کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک دو منزلہ مکان کے نیچے پرشین کارپٹس کا بورڈ لگا تھا۔ میں شوروم میں داخل ہوا تو فیاض بٹ ایک غیر ملکی گاہک کو قالین دکھا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ڈھاکہ میں جو کچھ ہو رہا ہے' اس سے یہ بے خبر ہے۔ مجھے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر بے اختیار ہو کر بغل گیر ہو گیا۔ اپنے غیر ملکی گاہک کو انگریزی میں میرا تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگا:

"دیکھو۔ یہ میرا بھائی لاہور سے میری خیریت معلوم کرنے اتنی خطرناک جگہ پر پہنچ گیا ہے۔"

شاہد بٹ اوپر تھا۔ اس کو معلوم ہوا تو دوڑ کر نیچے آگیا اور مجھے گلے لگ کر ملا۔ میں اور شاہد بٹ ایک طرف بیٹھ کر لاہور کے اور ڈھاکہ کے حالات پر گفتگو کرنے لگے۔ گاہک کو رخصت کر کے فیاض بھی ہمارے پاس آگیا۔ ڈھاکہ میں جس قسم کے سنگین بلکہ خون ریز حالات بن گئے تھے' ان سے وہ بھی پریشان تھے لیکن جب میں نے انہیں کہا کہ وہ شوروم کے کچھ قیمتی قالین ساتھ لے کر کسی طرح میرے ساتھ چھاؤنی چلے چلیں تو فیاض کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اسکی ضرورت نہیں ہے' فوج حالات کو قابو کر لے گی۔ آخر ہم پاکستان میں بیٹھے ہیں۔ کسی غیر ملک میں نہیں۔۔۔"

شاہد بٹ نے کہا:

"فوج کو تو سیاست دانوں نے چھاؤنی میں بٹھا رکھا ہے۔"

دوپہر کے وقت ہم شوروم کے باہر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور دھان منڈی کی طرف سے بے شمار پرندے شور مچاتے اڑتے نظر آئے۔ بازار میں لوگ ادھر ادھر پناہ لینے کے لئے دوڑ پڑے۔ ہم بھی شوروم کے اندر چلے گئے۔ شاہد بٹ کہنے لگا:

"دھان منڈی کی طرف شیخ مجیب الرحمان کا مکان ہے۔ وہاں کچھ پنجابی بھی رہتے ہیں۔ بنگالیوں نے وہاں بم مارا ہو گا۔"

اس کے چند منٹ بعد اقبال ہائی سکول کی جانب سے بھی بموں کے دو دھماکے ہوئے۔ اب فیاض بٹ کو بھی احساس ہوا کہ وہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ ان دھماکوں کے بعد عام افواہ پھیل گئی کہ مکتی باہنی فورس محمد پور کے بہاریوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کا قتل عام کرنے آ رہی ہے۔ میر پور کالونی اگرچہ بہاریوں نے آباد کی تھی مگر وہاں پر پنجابیوں اور پٹھانوں کے کنبے بھی آباد تھے۔ بنگالیوں نے مقامی ہندوؤں اور بھارت کی مکتی باہنی فورس کے ساتھ مل کر میر پور کالونی کا پانی بند کر دیا تھا۔ بجلی بھی کاٹ دی تھی۔ میر پور والوں نے کچھ دیر تک مکتی باہنی فورس کا مقابلہ کیا اور ان کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ بھی کرتے رہے۔ لیکن مکتی باہنی فورس کو بھارت اسلحہ سپلائی کر رہا تھا۔ جب میر پور والوں کے پاس اسلحہ ختم ہو گیا تو اس آبادی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مکتی باہنی مقامی ہندو اور بھارتی پراپیگنڈے سے گمراہ مسلمان بنگالی میر پور میں گھس گئے۔ انہوں نے چن چن کر مردوں' بوڑھوں اور بچوں کو بے دردی سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذبح کردیا اور جوان عورتوں کو اٹھاکر لے گئے۔اس علاقے سے ایک اندازے کے مطابق ہزاروں غیربنگالی عورتیں اغوا کی گئیں' جنہیں کلکتہ میں لے جاکر فروخت کردیا گیا اور جن کا آج تک کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ محمد پور والی آبادی ابھی تک بچی ہوئی تھی لیکن اس افواہ نے اس علاقے میں بھی افرا تفری مچادی کہ مکتی باہنی ادھر کارخ کررہی ہے۔

ہم نے محمد پور چھوڑ کر چھاؤنی جانے کا فیصلہ تو کرلیا لیکن سوال یہ تھا کہ وہاں سے نکلا کیسے جائے۔ راستے میں ایوب گیٹ کے آگے چوک میں محمد پور سے نکلنے والوں کا سامان لوٹ کر انہیں قتل کردیا جاتا تھا۔ میرے کزن چونکہ قالینوں کا کاروبار کرتے تھے' اس لئے ان کے شوروم میں غیرملکی سفارت خانوں کے لوگ بھی قالین دیکھنے اور خریدنے آتے تھے۔ اتفاق سے دوسرے روز آسٹریلین ایمبیسی کا ایک گورا گاڑی لے کر قالین خریدنے آگیا۔ دونوں نے اس کے آگے صورت حال بیان کی اور کہا کہ ہمیں کسی طرح اپنی گاڑی میں چھپاکر چھاؤنی پہنچادو۔ آسٹریلین راضی ہوگیا۔ فوراً گاڑی میں کچھ قیمتی قالین ڈالے۔ ان کے درمیان میں' فیاض اور شاہد چھپ گئے۔ ہمارے اوپر بھی قالینوں کے رول ڈال کر اوپر ترپال ڈال دی گئی۔ شوروم کو تالا لگادیا گیا تھا۔ گاڑی چھاؤنی کی طرف روانہ ہوگئی۔

خیال تھا کہ یہ غیرملکی سفارت خانے کی گاڑی ہے' بنگالی اس کی تلاشی نہیں لیں گے۔ مگر محمد پور سے نکلنے کے بعد ایوب گیٹ سے ذرا آگے جب گاڑی چوک میں پہنچی تو اسے روک لیا گیا۔ ہم نے قالینوں کے نیچے چھپے چھپے آسٹریلین سفارت کار کی ایک بنگالی سے انگریزی میں باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ وہ بنگالی کو سمجھا رہا تھا کہ وہ آسٹریلین سفارت کار ہے اور سفارت خانے کے لئے کچھ قالین خرید کر لے جارہا ہوں۔ خدا جانے بنگالیوں کے دل میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے ٹرک نما گاڑی کی تلاشی

لئے بغیر اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد گاڑی کو چھاؤنی کی فوجی چیک پوسٹ پر روکا گیا۔ مگر اس وقت ہم قالینوں کے درمیان سے باہر نکل آئے تھے۔ پاک فوج کے جوانوں نے گاڑی کی تلاشی لے کر صرف یہ دیکھا کہ کہیں گاڑی میں کوئی دھماکہ خیز مواد تو نہیں ہے۔ ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔

ہم سیدھے کرنل صاحب کے کوارٹر میں گئے۔ وہ شاہد بٹ اور فیاض بٹ کو جانتے تھے اور اکثر ان کے شوروم میں جایا کرتے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے اور حیران بھی ہوئے کہ ہم اس جہنم سے کیسے بچ کر نکل آئے۔ اس کے بعد ڈھاکہ کے حالات دن بدن بھیانک ہوتے گئے۔ سب لوگ حیران تھے کہ فوج کو چھاؤنی میں کس نے بند کر رکھا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ کرنل صاحب سے پوچھتے تو وہ کہتے کہ ہمیں یہی آرڈر ملا ہے کہ چھاؤنی میں رہو۔ ہم اس آرڈر کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔ اس دوران ہم نے مغربی پاکستان جانے کی کوششیں شروع کردیں۔ دن میں صرف ایک طیارہ مغربی پاکستان سے ڈھاکہ آتا تھا۔ یہی طیارہ ڈھاکہ سے غیربنگالیوں کو لے کر واپس مغربی پاکستان چلا جاتا تھا۔ ائر پورٹ کے باہر ہزاروں غیربنگالی کنبے اپنی جانیں بچاکر وہاں ہزاروں کی تعداد میں بیٹھے تھے اور مغربی پاکستان جانے والی پروازمیں اپنی باری کا انتظار کررہے تھے۔ پی آئی اے کی جانب سے ٹوکن ایشو ہوتے تھے۔ ٹوکن پر نمبر لکھا ہوتا تھا۔ کرنل صاحب کی مدد سے ہمیں بھی تین ٹوکن مل گئے۔ ہم ٹوکن لے کر ائر پورٹ پر پہنچے تو وہاں اتنی لمبی لمبی قطاریں لگی تھیں کہ ایسی قطاریں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ہم نے ایک پٹھان سے اسکا ٹوکن لے کر دیکھا۔ اس پر جو نمبر لکھا تھا۔ اس کے حساب سے ہماری باری ابھی بہت دور تھی۔ میرے ٹوکن نمبر اور فیاض اور شاہد کے ٹوکن میں بھی ایک ہزار کا فرق تھا۔ سوائے اپنی باری کا انتظار کرنے کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد شاہد اور فیاض کی باری آگئی۔ میری باری ابھی بہت دور تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں سے کہا:

"تم لوگ لاہور پہنچو۔ اللہ نے چاہا تو میں بھی اپنی باری آنے پر تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیسے بھیانک واقعات پیش آنے والے ہیں۔ دونوں بھائیوں کو میں نے اور کرنل صاحب نے طیارے میں سوار کرادیا اور طیارہ مغربی پاکستان کی طرف پرواز کر گیا۔

اس اعتبار سے مجھے بڑا سکون محسوس ہوا کہ جس کام اور جس مقصد کو لے کر میں ڈھاکہ آیا تھا' وہ خیرو خوبی سے پورا ہو گیا ہے۔ اب میں پی آئی اے کے طیارے میں لاہور جانے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر گیا۔ میں روز ایئر پورٹ پر جاکر معلوم کرتا۔ میرا نمبر ابھی بہت دور تھا۔ اسی اثنا میں ڈھاکہ میں لاقانونیت' لوٹ مار' غیر بنگالیوں کے قتل عام اور عورتوں کے اغوا میں اضافہ ہوتا گیا۔

پھر اچانک ایک رات توپ چلنے کی آواز آئی۔ کرنل صاحب ایک دن پہلے ہی اپنی رجمنٹ میں چلے گئے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد توپوں کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ میں کوارٹر میں اکیلا تھا۔ کرنل صاحب کا خاص ملازم جاگ رہا تھا اور کوارٹر کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کہیں انڈیا نے تو نہیں حملہ کر دیا؟"

یہ بنگالی مسلمان تھا اور زبردست محب وطن بنگالی تھا۔ کہنے لگا۔

"صاحب! یہ اپنی فوجوں کی توپوں کی آواز ہے' ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پاک فوج نے مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں کی طرح ڈھاکے میں داخل ہو کر وہاں بھارتی دہشت گرد مکتی باہنی فورس کا صفایا شروع کر دیا۔ مکتی باہنی فورس کی اکثریت بھارت بھاگ گئی۔ فوج نے شہر کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ ٹوٹے ہوئے پلوں کی از سر نو تعمیر شروع ہو گئی۔ شہر میں دیکھتے دیکھتے امن و امان بحال ہو گیا اور محب وطن بنگالی مسلمان اور پنجابی بہاریوں پٹھانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سڑکوں پر سے رکاوٹیں صاف کر دی گئیں۔ ٹریفک بحال ہو گئی۔ دوکانیں اور منڈیاں پھر سے کھل گئیں اور کاروبار شروع ہو گیا۔ لوگ آزادی اور بے فکری سے کاروبار کرنے لگے۔ طیاروں کی پروازیں بھی شروع ہو گئیں۔ اب ٹوکن نمبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایئر پورٹ پر جو مہاجرین مغربی پاکستان جانے کے لئے بیٹھے تھے' وہ واپس اپنے مکانوں میں چلے گئے۔

اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میں لاہور واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ لاہور سے فیاض اور شاہد بٹ کا فون آگیا کہ ڈھاکہ میں امن و امان ہو گیا ہے' ہم واپس آرہے ہیں۔ میں نے سوچا دو چار دن مزید ٹھہر جاتا ہوں۔ بھائی آرہے ہیں' ان کے پاس اطمینان اور سکون کے کچھ دن گزاروں گا اور پھر لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے لاہور جانے کا اپنا پروگرام منسوخ کر دیا۔ دونوں بھائی ڈھاکہ پہنچ گئے۔ چھاؤنی میں انہوں نے جو قیمتی قالین رکھے تھے' وہ اٹھا کر محمد پور والے اپنے شوروم میں واپس لے گئے۔ ان کے شوروم کا کافی سامان لوٹا جا چکا تھا۔ مگر انہوں نے کوئی پروا نہ کی اور پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ دوبارہ اپنا کام شروع کر دیا۔

فوج نے حالات اس طرح ٹھیک کر دیئے کہ ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ مکتی باہنی فورس بھارت فرار ہو گئی۔ فوج نے سرحدوں پر کنٹرول سنبھال لیا۔ محب وطن بنگالیوں نے شہر شہر گاؤں گاؤں پاک فوج کے حق میں جلوس نکالے۔ مشرقی پاکستان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فضائیں ایک بار پھر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ اس دوران بھارت خاموشی سے جنگی تیاریوں میں لگا رہا۔ سرحد کے پار بھارت کی سرزمین پر مشرقی پاکستان کے بھاگے ہوئے ہندو بنگالیوں کو کمانڈو ٹریننگ دینے کے سنٹر کھل گئے۔ میرا دل ڈھاکے میں لگ گیا تھا۔ میں کچھ مہینے مشرقی پاکستان میں گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے مشرقی پاکستان کے کئی شہروں کی سیاحت کی۔ ہر جگہ سلامتی اور سکون کی فضا قائم تھی۔ لوگ بڑے اعتماد کے ساتھ کاروبار کر رہے تھے۔ ندیوں کے ٹوٹے ہوئے پل دوبارہ بن گئے تھے۔ گڑبڑ کے حالات میں جو لوگ مغربی پاکستان چلے گئے تھے' انہوں نے واپس آکر اپنا اپنا کاروبار دوبارہ سنبھال لیا تھا۔ شہروں کی رونقیں واپس آچکی تھیں' لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔

ایک روز معلوم ہوا کہ بھارت نے مشرقی سرحدوں پر حملہ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ حملہ باقاعدہ جنگ کا اعلان نہیں تھا مگر اس کا ایکشن باقاعدہ بڑے پیمانے پر فوجی حملے ایسا ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھارت نے ہزاروں کی تعداد میں مکتی باہنی فورس سفید کپڑوں میں مشرقی پاکستان میں داخل کر دی۔ اس سے پہلے ہزاروں ہندو بھی مشرقی پاکستان میں سرحد پار کر کے آچکے تھے۔ ان کو بھارتی فوج نے گوریلا جنگ کی تربیت دے رکھی تھی۔ اس دفعہ مکتی باہنی فورس میں بھارتی فوج کے کمانڈوز بھی شامل تھے۔ انہوں نے شہروں اور دیہات میں تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں۔ عالمی رائے عامہ کے ڈر سے بھارت نے اپنی فوج مشرقی پاکستان میں داخل نہیں کی تھی مگر اس کے کمانڈوز سویلین کپڑوں میں ہر طرف پھیل گئے تھے۔ شہروں میں ایک بار پھر بموں کے دھماکے شروع ہو گئے۔ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی تعداد وہاں کی ہزاروں میل لمبی سرحد کو دیکھتے ہوئے بہت کم تھی۔ اس کے باوجود پاک فوج ہر محاذ پر دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی۔ شہروں کا امن و سکون ایک بار پھر منتشر ہونے لگا۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کا اعلان کر دیا۔ اب ایسا ہوا کہ مغربی پاکستان کا محاذ بھی کھل گیا۔ بھارت نے کشمیر میں ہزیمت اٹھانے کے بعد لاہور پر حملہ کر دیا۔ یوں بھارت اور پاکستان میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ بھارت کی فوجی ہائی کمان کو موقع مل گیا۔ اس نے مشرقی پاکستان پر پوری طاقت سے حملہ کر دیا۔ بھارتی بمبار طیاروں نے مشرقی پاکستان کے ہوائی اڈوں' پلوں اور ریل گاڑیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ڈھاکہ میں پاک فضائیہ کے طیاروں کی تعداد بہت کم تھی۔ اپنی فضائیہ کے طیارے دشمن کے طیاروں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے فضا میں بلند ہوتے اور بھارتی طیارے زیادہ دیر نہ ٹھہرتے۔ ایک دو طیارے مار گرائے جاتے اور باقی بھاگ جاتے۔ مغربی پاکستان سے اب کوئی طیارہ ڈھاکہ نہیں آسکتا تھا۔ اپنی فوج کو اسی گولہ بارود سے لڑنا تھا جو مشرقی پاکستان کے سٹوروں میں موجود تھا۔ یہ اس جنگ کا بے حد دردناک پہلو ہے کہ کس طرح ہماری بہادر فوج نے نامساعد بلکہ ناممکن حالات میں تھوڑی نفری' محدود اسلحے کے ساتھ اپنے سے دس گنا زیادہ طاقتور دشمن کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ محاذ ہزاروں میل لمبا تھا۔ بنگالی عوام جن میں بھاری تعداد مکتی باہنی اور بھارت سے سمگل کی گئی ہندو بنگالیوں کی گوریلا فورس سے تھی' شہروں میں جگہ جگہ تخریبی کارروائیاں کر رہے تھے۔ شیخ مجیب نے اعلان کر دیا تھا کہ بنگال میں مقیم تمام پنجابیوں' پٹھانوں اور بہاریوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ میں ایک بار پھر محمد پور میں فیاض اور شاہد کے ساتھ بند ہو گیا۔ شہر میں جگہ جگہ بم پھٹ رہے تھے۔

حالات بڑی تیزی سے خراب تر ہوتے گئے۔ پہلے بھارتی جہاز بم گرانے آتے تھے تو ہمارے لڑاکا طیارے فوراً فضا میں ان کے مقابلے کے لئے آجاتے تھے۔ اب ہمارا کوئی طیارہ فضا میں دکھائی نہ دیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ انڈین بمبار طیاروں نے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پے در پے بم گرا کر اسے تباہ کر دیا ہے۔ بھارتی طیارے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزادی کے ساتھ بمباری کر کے واپس چلے جاتے۔ بنگالی عوام کو شیخ مجیب نے پاکستانی فوج کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کر کے انہیں فوج کا دشمن بنا دیا تھا۔ فوج کی سپلائی لائن پر جگہ جگہ حملے کر کے اسے شدید نقصان پہنچایا جاتا۔ ہزاروں میل لمبے اور کٹے پھٹے محاذ پر اپنی فوج صرف جذبے کے زور پر بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ نہ انہیں کمک پہنچتی تھی، نہ گولہ بارود۔ جس پوسٹ میں جتنا گولہ بارود تھا، فوج اسی سے لڑ رہی تھی۔ بھارتی بزدل گوریلے مقامی ہندو بنگالیوں کی مدد سے ندیوں میں سٹیمروں پر لدے ہوئے ہماری فوج کے ایمونیشن کو دھماکوں سے اڑا رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں بھارتی فوج کو ہر محاذ پر تازہ کمک بھی پہنچ رہی تھی اور اس کی سپلائی لائن بھی محفوظ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارتی فوج کئی جگہوں پر مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئی۔ ہر محاذ پر گھمسان کی لڑائی چھڑ گئی۔ اپنی فوج کا جو جوان جہاں لڑ رہا تھا، وہیں لڑتے لڑتے جب اسلحہ ختم ہو جاتا تو شہید ہو جاتا مگر دشمن کے ہاتھوں قید نہ ہوتا۔ کوئی جوان زخمی ہو جاتا تو اسے طبی امداد دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے مشرقی پاکستان کے جنگلوں میں اپنی بہادر فوج کے جوانوں کو اس حالت میں لڑتے دیکھا ہے کہ ان کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ جسم بخار میں پھنک رہے تھے۔ ایمونیشن ختم ہو رہا تھا۔ پیچھے سے ایمونیشن آنے کی کوئی امید نہیں تھی مگر وہ اس عالم میں بھی اپنی اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا کہ ہمیں کن حالات میں لڑایا جا رہا ہے۔ ان کے سینوں میں وطن عزیز کی حرمت کے تحفظ اور اسلاف کی تابندہ روایات کا جذبہ موجزن تھا۔ مگر صرف جذبے سے جنگیں نہیں جیتی جاتیں۔ جنگ جیتنے کے لئے جذبے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ جوانوں کو اسلحہ ملتا رہے، راشن ملتا رہے، سپلائی لائن قائم رہے، ان کی بدلی ہوتی رہے، وہاں اس قسم کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے

باوجود ہر جوان کو معلوم تھا کہ وہ جس جگہ لڑ رہا ہے، اسے وہیں لڑتے لڑتے شہید ہونا ہے اور ہمارے دلیر غیور جوان لڑ رہے تھے اور لڑتے لڑتے شہید ہو رہے تھے۔

مشرقی پاکستان کے گاؤں قصبے اور سرحدی شہر ایک ایک کر کے بھارتی فوج کی جھولی میں پکے پھل کی طرح گرنے لگے۔ اس کے باوجود یہ بات اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن جائے گا۔ لیکن جو ہونا تھا، آخر وہ ہو کر رہا۔ چند دن پہلے یہ آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔۔۔ انڈیا کے بمبار جہاز بھی آنا بند ہو گئے تھے۔ شیخ مجیب کے حامیوں نے بنگلہ دیش کے پرچم شہر میں جگہ جگہ لہرا دیئے تھے۔ پھر ایک روز یہ افواہ اچانک گردش کرنے لگی کہ حکومت پاکستان نے جنگ بند کر دینے کا حکم دے دیا ہے۔ ہم نے یہی سمجھا کہ شاید دونوں ملکوں میں کوئی جنگ بندی کا کوئی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ لیکن دوپہر کے وقت یہ روح فرسا خبر سنی کہ پاکستان کی مشرقی فوجی کمان نے بھارت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ہم پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ ہم سکتے میں آ گئے۔ مشرقی پاکستان کے سبھی محب وطن پاکستانی بنگالی بہاری پنجابی اور پٹھان سکتے میں آ گئے۔

پہلے اس خبر کو افواہ تصور کیا۔ لیکن بہت جلد یہ افواہ حقیقت میں بدل گئی۔ معلوم ہوا کہ بھارتی فوجیں عنقریب ڈھاکہ شہر میں داخل ہونے والی ہیں۔ بنگالی بنگلہ دیش کے پرچم لے کر نعرے لگاتے سڑکوں پر نکل آئے۔ آناً فاناً ساری فضا بدل گئی۔ مکتی باہنی فورس بنگالی ہندوؤں کے ساتھ خدا جانے کہاں سے شہر میں وارد ہوئی اور انہوں نے غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس وقت میں، شاہد بٹ اور فیاض بٹ محمد پور والے مکان کے شو روم میں ہی تھے۔ فیاض بٹ بولا:

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ ہماری فوج کبھی ہتھیار نہیں ڈال سکتی"۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاہد نے کہا: "یہ سارا سیاست دانوں کا کیا دھرا ہے۔ انہوں نے ہم سب کو دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے۔"

میں نے کہا: "ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ مکتی باہنی والے بہت جلد یہاں بھی آجائیں گے اور ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

فیاض بٹ کہنے لگا: "ہم بری طرح پھنس گئے ہیں' سارے راستے بند ہیں۔ کرنل صاحب بھی اب ہماری مدد نہیں کر سکتے۔ وہ خود بے بس کر دیئے گئے ہیں۔"

شاہد بٹ بولا: "میرا تو خیال ہے کہ ہمیں کسی طریقے سے کلکتے کی طرف سرحد پار کر کے نکل جانا چاہئے۔ وہاں قمرلالہ کے پاس چلے جائیں گے۔"

قمرلالہ ان کے قریبی رشتے دار تھے جو شروع ہی سے کلکتے میں شالوں کا بزنس کر رہے تھے اور ذکریا سٹریٹ میں رہتے تھے۔ میں نے کہا: "سرحدوں پر بھارتی فوج بیٹھی ہے' اس سے کیسے بچو گے؟"

فیاض نے مشورہ دیا: "ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم یہاں سے شمال کی جانب جنگلوں میں جا کر غائب ہو جائیں اور وہاں سے نیپال جانے کی کوشش کریں یا پھر برما کی طرف نکل جائیں۔"

یہ سب خیالی پروگرام تھے۔ خیالات کے گھوڑے دوڑائے جا رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم بھی مشرقی پاکستان میں مقیم دوسرے غیر بنگالیوں کی طرح موت کے پھندے میں پھنس چکے تھے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ اگلے لمحے ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔

ہم باہر نکل آئے۔ سڑک پر بنگالی نعرے لگاتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے انہوں نے غیر بنگالیوں کے مکانوں پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔

لوگ اپنے مکانوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ ایک طرف سے دو جیپیں آئیں جن میں فوجی لباس میں مکتی باہنی والے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سٹین گنیں تھام رکھی تھیں اور ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔

شوروم میں آکر ہم نے دروازے اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پردہ ہٹا کر کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھنے لگے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے مکتی باہنی والوں نے سامنے والے مکان پر دھاوا بول دیا۔ مکان کے اندر سے عورتوں بچوں کی چیخیں سنائی دیں۔ پھر فائرنگ کی آواز آئی اور مکتی باہنی والے تین نوجوان عورتوں کو گھسیٹ کر مکان سے باہر لے آئے۔ دو بنگالی اس گھر کے ایک بوڑھے شخص کو بھی باہر لائے اور ایک بنگالی نے اس کی گردن پر "جئے بنگلہ" کا نعرہ لگا کر چھرا اتنی زور سے مارا کہ بوڑھے کی گردن تن سے جدا ہو کر سڑک پر گر پڑی۔ ہم جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ فیاض نے اپنے بھائی سے کہا:

"سیف میں جتنا پیسہ ہے' نکال کر تھیلے میں ڈالو-------"

سیف میں سے تمام نوٹوں کی گڈیاں نکال کر چمڑے کے ایک تھیلے میں ڈال کر ہم تینوں مکان کی چھت پر آگئے۔ میں نے کہا: "یہاں سے ہم کہاں جائیں گے۔"

فیاض نے کہا: "بس اب یہی ایک راستہ ہے بچاؤ کا۔"

ابھی ہم چھت پر ہی تھے کہ نیچے سے ہمارے شوروم کے دروازے کو توڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ والے مکان کی چھت ہماری چھت سے کوئی پانچ چھ فٹ نیچی تھی۔ ہم تینوں دوسرے مکان کی چھت پر کود گئے۔ یہ ایک بہاری بابو کا مکان تھا جو ڈھاکہ ریلوے سٹیشن پر ملازم تھا اور اپنی ایک جوان بیٹی' بیوی اور دو جوان لڑکوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ دونوں جوان بیٹے چٹاگانگ میں ملازم تھے۔ بوڑھا بہاری بابو جس کا نام امین الدین تھا اپنی جواں سال بیٹی اور بیوی کے ساتھ مقیم تھا۔ بیٹی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی اگلے ماہ شادی ہونے والی تھی۔ اسکا سارا جہیز گھر میں تیار پڑا تھا۔ مکان کی چھت والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ فیاض نے آگے جھک کر نیچے صحن میں دیکھا اور آواز دی۔۔

"امین بابو! دروازہ کھولیں۔ میں ہوں فیاض' شاہد بھی میرے ساتھ ہے۔۔
"

اس گھر میں ایک بنگالی ملازم بھی رہتا تھا۔ لڑکا سا تھا۔ سب اسے باجو باجو کہتے تھے۔ باجو نے اوپر آکر دروازہ کھول دیا۔ ہم تینوں تیزی سے زینے پر سے اتر کر نیچے دوسری منزل کے دالان میں آگئے۔ بہاری بابو اپنی بیوی اور جوان بیٹی کے ساتھ کمرے میں انتہائی خوفزدہ اور سکتے کی حالت میں بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوف زدہ لہجے میں بولا:

"کیا مکتی باہنی آگئی؟"

فیاض نے کہا:۔ "بابو! مکتی باہنی کے غنڈے ہمارے شوروم کو توڑ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ آپ بھی یہاں سے نکل چلیں۔ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

بہاری بابو کی بیوی اور بیٹی رونے لگیں۔ بہاری بابو کے چہرے پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ خشک آواز میں بولا:۔ "ہم کہاں جائیں گے؟ بیٹی کا سارا سامان گھر میں پڑا ہے۔"

شاہد نے کہا:۔ "بابو جی عزت بچائیں۔ جان بچائیں۔ مال کی فکر نہ کریں۔ بازار میں مکتی باہنی والے بہاریوں' پنجابیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ عورتیں اغوا کر رہے ہیں۔ سامنے والے مکان کے میر صاحب کی ساری فیملی کو قتل کر کے ان کی بیٹیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

یہ سن کر بہاری بابو کی بیوی اور بیٹی اٹھ کھڑی ہوئیں۔۔

"یہاں سے بھاگ چلو ابا۔۔ خدا کے لئے بھاگ چلو۔"

یہ بہاری فیملی بھی ہمارے ساتھ اپنے بھرے پرے مکان کو چھوڑ کر گلی میں آگئی۔ اس گلی میں سے ایک راستہ کسی دوسرے محلے کی طرح جاتا تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ وہاں فیاض اور شاہد بٹ کا ایک عیسائی دوست رہتا تھا۔ یہ عیسائی برطانوی سفارت خانے میں کسی معمولی عہدے پر ملازم تھا اور فیاض اور شاہد کے شوروم میں اکثر آکر بیٹھا کرتا تھا اور ان کا دوست بن گیا ہوا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی اور مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ ہم اس کے مکان کی طرف بھاگے۔ تو وہاں پہنچ کر بہاری بابو کو جانے کیا خیال آیا۔ کہنے لگا:۔

"میں بچی کو لے کر وہاں نہیں جاؤں گا۔ وہ کرسچن ہمیں پکڑوا دے گا۔"

فیاض نے کہا:۔ "بابو جی! ایڈورڈ بڑا نیک آدمی ہے۔ میرا دوست بھی ہے۔ کسی اور طرف مت جائیں' ماریں جائیں گے۔"

مگر بہاری بابو نہ مانا۔ کہنے لگا:

"میں اپنے بھانجے کے ہاں چلا جاتا ہوں۔ اس کا مکان ساتھ والی گلی میں ہے۔ وہاں سے ہم میرپور کالونی میں چلے جائیں گے۔"

ہم نے انہیں مجبور نہ کیا۔ اور بہاری بابو امین الدین اپنی بیوی اور بچی کو لے کر ہم سے جدا ہو گیا۔ اس کے بعد ہمیں اس کے بارے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا گذری۔ ظاہر ہے میرپور کی کالونی کے غیر بنگالیوں کے ساتھ جو کچھ گذری' وہی بہاری بابو کے ساتھ بھی گذری ہوگی۔ ہم وہاں گلیوں میں سے گذرتے فیاض شاہد کے عیسائی دوست ایڈورڈ کے مکان پر آگئے۔ گلیوں میں بنگالی ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ فیاض اور شاہد بٹ کے رنگ گورے تھے اور وہ شکل صورت سے کسی طرح بھی بنگالی نہیں لگتے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایڈورڈ گھر پر ہی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے اوپر والے کمرے کی بیٹھک کھول دی۔ حالات سے وہ بھی پوری طرح باخبر تھا۔ کہنے لگا:

"مجھے تم لوگوں کی ہی فکر لگی تھی۔ تم نے اچھا کیا جو وہاں سے بھاگ آئے۔"

فیاض نے ایڈورڈ سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ ہمارے کزن ہیں اور ہمارے ساتھ یہاں آکر یہ بھی پھنس گئے ہیں۔ ایڈورڈ اگرچہ ادھیڑ عمر کے قریب تھا مگر اس کی صحت اچھی تھی اور جسم ورزشی تھا۔ اس نے کہا:

"تم لوگ یہاں رہو۔ یہاں کوئی مکتی باہنی کا غنڈا بنگالی نہیں آئے گا۔ سب کو معلوم ہے کہ یہاں ایڈورڈ رہتا ہے جو کرسچن ہے۔ میں نے مکان کے باہر صلیب کا نشان بھی بنا دیا ہے۔"

فیاض نے تھیلا ایڈورڈ کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

"جتنے نوٹ سیف میں پڑے تھے، ہم نکال لائے ہیں۔ یہ تم اپنے پاس کسی جگہ چھپا کر رکھ دو۔"

ایڈورڈ نے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

"نہیں بھائی۔ پیسے کا معاملہ ہے۔ یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

شاہد کہنے لگا:

"ایڈورڈ کیا ہم کسی طرح برطانوی سفارت خانے میں جا سکتے ہیں؟ ہم وہاں محفوظ ہو جائیں گے۔"

ایڈورڈ نے کہا:

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کیونکہ شہر میں بنگالی جس بے دردی سے غیر بنگالیوں کو قتل کر رہے ہیں، اسے دیکھتے ہوئے میں عیسائی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ میں پنجابی نہیں ہوں۔ جبل پور کا رہنے والا ہوں۔"

اس وقت ہمیں دوسرے محلوں اور محمد پور کے میونسپل ہال کی جانب سے فائرنگ کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ ایڈورڈ نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانک کر نیچے گلی میں دیکھا۔ پھر کھڑکی بند کر دی اور بولا:

"فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد حالات ایکدم پلٹ گئے ہیں۔ اب ہم پاکستان میں نہیں بنگلہ دیش میں ہیں اور یہ لوگ کسی غیر بنگالی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں آج ایمبیسی بھی نہیں جا سکا۔ یہاں پر قریب کوئی ٹیلی فون بھی نہیں ہے کہ میں فون کر کے گاڑی منگوا لیتا۔"

پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد خود ہی بولا:

"سفارت خانے میں بھی حالات غیر یقینی ہیں۔ ہمارے بنگالی ڈرائیور بھاگ گئے ہیں۔ ایک بہاری ڈرائیور تھا وہ بھی جان بچا کر کل فرار ہو گیا تھا۔ اب یہاں گاڑی کون لائے۔ میں وہاں ہوتا تو گاڑی لا کر تم لوگوں کو اپنے ساتھ سفارت خانے لے جاتا۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہم کسی نہ کسی طرح سفارت خانے پہنچ جائیں گے۔"

اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ایڈورڈ نے ایک مرغی روسٹ کر لی۔ تھوڑے سے چاول بنائے۔ ہم سب نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھائے اور ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئے کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہم جانیں بچا کر برطانوی سفارت خانے پہنچ جائیں گے""؟

میں نے فیاض سے کہا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں چھاؤنی جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کرنل صاحب وہاں ہوئے تو ان کے اردلی کو فوجی گاڑی میں لے کر یہاں آجاؤں گا اور ہم چھاؤنی چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے چھاؤنی میں ہماری فوج ابھی تک بالکل محفوظ ہے۔ ویسے بھی مکتی باہنی کے غنڈے چھاؤنی کا رخ کبھی نہیں کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

فیاض اور شاہد نے میری اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ ایڈورڈ کچھ سوچ کر بولا: "ویسے تجویز اتنی بری نہیں ہے کیونکہ شہر میں فوجی گاڑیاں پھر رہی ہیں۔ اگر تم لوگ کسی طریقے سے چھاؤنی چلے جاؤ تو کم از کم وہاں تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔
"

فیاض اور شاہد نہ مانے۔ لیکن ایڈورڈ کی اس بات نے میری تجویز کو میرے ذہن میں پکا کر دیا کہ شہر میں فوجی گاڑیاں ابھی تک چل رہی ہیں۔ میں نے سوچ لیا کہ میں ان لوگوں کو بتائے بغیر چھاؤنی کی طرف نکل جاؤں گا اور وہاں سے فوجی گاڑی لے آؤں گا اور انہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنی اس احمقانہ تجویز پر عمل شروع کرتے ہی میری مصیبتوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

دوپہر کے بعد فیاض اور شاہد ایڈورڈ کے ساتھ چھت پر آس پاس کے حالات کا جائزہ لینے گئے تو میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ان کے سامنے نہیں جاسکتا۔ اس وقت مجھے موقع مل گیا۔ چنانچہ میں سیڑھیاں اتر کر گلی میں آیا اور بازار کی طرف چل پڑا۔ زندگی میں میں نے بڑی حماقتیں کی ہیں۔ ان میں بعض بڑی خطرناک حماقتیں تھیں۔ ان میں میری یہ حماقت بھی شامل تھی کہ میں چلتی تلواروں اور مکتی باہنی کے قتل عام اور فائرنگ میں باہر نکل آیا تھا۔ صرف باہر ہی نہیں نکلا تھا بلکہ محمد پور سے ڈھاکہ چھاؤنی جا رہا تھا۔ ایک بات میں ضرور خطرناک اور جان لیوا ہوتی تھی مگر اس میں دوسروں کے نقصان کا پہلو نہیں نکلتا تھا۔ شاید یہی ایک وجہ تھی کہ قدرت نے

میری ایسی ہر حماقت پر محفوظ رکھا۔ میں مصیبتوں اور مشکلات کے گڑھے میں ضرور گرا مگر وہاں سے نکل بھی آیا۔

وہ دوپہر کے بعد کا ٹائم تھا۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اس مہینے میں مشرقی پاکستان میں سردی تو نہیں ہوتی مگر دن کے وقت موسم بڑا خوشگوار ہوتا تھا۔ بازار میں کوئی کوئی دکان کھلی تھی۔ کچھ دکانیں لوٹی جاچکی تھیں۔ ٹوٹا پھوٹا سامان سڑکوں پر بکھرا پڑا تھا۔ یقیناً یہ دکانیں غیر بنگالیوں کی تھیں۔ میں نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بوٹ تھے۔ میں بازار میں دکانوں کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ جو دکانیں کھلی تھیں وہاں بیٹھے ہوئے بنگالیوں نے مجھے غور سے دیکھا مگر میں خاموشی سے چلتا گیا۔ چوک میں آیا تو دیکھا کہ بنگالی ایک دکان کو آگ لگا رہے تھے۔ ایک جیپ وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے وردی پوش بنگالی رائفلیں اور سٹین گنیں لئے اترے اور دکان کے اوپر مکان کی کھڑکیوں پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ یہاں سے مجھے چھاؤنی کا راستہ معلوم تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چوک میں سے گزر گیا۔

یہ بازار کشادہ تھا۔ اکثر دکانیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ ایک دکان کے آگے میں نے ایک آدمی کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش دیکھی تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میرے پیچھے سٹین گن اور رائفل کی فائرنگ کی آوازیں برابر گونج رہی تھیں۔ میں تھوڑی دور ہی گیا ہوں گا کہ ایک طرف سے بنگالیوں کا ہجوم تلواریں لہراتا اور رائفلوں کی فائرنگ کرتا نمودار ہوا۔ انہوں نے ایک گورے چٹے آدمی کو جو پنجابی یا پٹھان تھا آگے لگا رکھا تھا۔ اس بدنصیب کے تمام کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کی گردن میں رسی بندھی ہوئی تھی ایک بنگالی رسی سے اسے کھینچ رہا تھا اور بار بار زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔ چوک میں لاکر اس آدمی کو زمین پر گرا دیا گیا۔ ایک بنگالی نے میرے دیکھتے دیکھتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی آنکھوں میں خنجر کی نوک گھونپ کر اس کے دونوں ڈیلے باہر نکال کر ہوا میں اچھال دیے۔ اس کے بعد اس کے گلے پر خنجر چلانا شروع کر دیا۔

اچانک بائیں جانب والے بازار سے ایک چھوٹی بند ویگن آئی اور میرے پاس آکر زور سے بریک لگا کر رک گئی۔ اس میں سے ایک گورے نے جو انگریز یا امریکن یا آسٹریلوی تھا اور اس کے سر کے بال اور مونچھیں سفید تھیں۔ میری طرف دیکھ کر سخت لہجے میں بولا۔

"کیا تم پنجابی یا پٹھان ہو؟"

میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

"میں پنجابی ہوں۔"

بوڑھے نے غصے میں کہا۔

"بیوقوف۔ گاڑی میں بیٹھو۔"

انسان کی شکل میں یہ کوئی فرشتہ تھا جسے خدا نے میری مدد کے لئے بھیج دیا تھا۔ میں جلدی سے اسکے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن چل رہا تھا۔ ویگن بڑی تیزی سے آگے کی طرف نکل گئی۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"سیٹ پر سر نیچے کر لو۔"

میں نے سر نیچے کر لیا اور بالکل سمٹ سمٹا اس طرح بیٹھ گیا کہ سامنے سے مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ بوڑھے نے جو جرمن تھا اور ڈھاکے میں نوادرات کا کام کرتا تھا مجھ سی پوچھا۔

"تم کہاں جا رہے تھے؟"

میں نے کہا۔

"چھاؤنی۔ میرا کزن وہاں کرنل ہی۔"

وہ بولا۔

"تمہاری فوج نے تو ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ انڈیا کی فوج یہاں آنے والی ہے۔ وہاں تمہارا کرنل کزن خود ہی مصیبت میں ہو گا وہ تمہیں کہاں سنبھالتا پھرے گا۔ تم بھی اس کے ساتھ انڈیا کی قید میں چلے جاؤ گے۔"

قید کا سن کر میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔

"پھر میں کہاں جاؤں۔ میں یہاں اکیلا اپنے کزن کے پاس تھا وہاں مکتی باہنی والے آگئے ہیں۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔"

جرمن بوڑھا بڑے غور سے آگے کو جھک کر گاڑی چلا رہا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں چھاؤنی تمہارے کزن کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ اوکے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوکے سر۔"

جرمن بوڑھا بڑبڑانے لگا۔ گاڑی سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔

☆☆☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہماری گاڑی اس سڑک پر آگئی جس کی دونوں جانب عمارتیں تھیں اور جو سیدھی ائرپورٹ اور چھاؤنی کو جاتی تھی۔ یہاں دو مکانوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگ لوٹ مار کر رہے تھے۔ جرمن بوڑھا تیزی سے گاڑی آگے نکال کر لے گیا۔ کہنے لگا۔

"تم اپنے مکان سے کیوں نکل آئے تھے؟۔ تم احمق ہو۔"

ایک مکان میں سے بنگالیوں کا ہجوم دو آدمیوں اور ایک عورت کو گھسیٹ کر باہر نکال رہا تھا۔ بنگالی آدمیوں پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ دونوں آدمی غیر بنگالی تھے۔ ان کا خون بہہ رہا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر دوسرا چوک آگیا۔ وہاں ایک اور ہولناک منظر تھا۔ ایک گاڑی سڑک پر کھڑی تھی۔ سڑک پر ایک آدمی بے بسی کے عالم میں پڑا تھا۔ ایک بنگالی اس کی گردن پر چھری چلا رہا تھا۔ میرا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔ جرمن بوڑھے نے تیزی سے گاڑی دائیں جانب موڑی اور اسے فل سپیڈ پر چھوڑ دیا۔ وہ غصے میں بولا۔

"تم چھاؤنی نہیں جاسکتے۔ یہ لوگ تمہیں راستے میں ہی قتل کر دیں گے۔"

اس ہولناک منظر کو دیکھ کر میں ڈر گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جرمن بوڑھا مجھے اپنے ہاں چھپالے۔ میں سہما ہوا بیٹھا تھا۔ گاڑی مختلف بازاروں سے گزرتی ہوئی کھلے

علاقے میں آگئی۔ یہ ڈھاکہ کا گلشن کا علاقہ تھا۔ یہاں سفارت کاروں اور مالدار لوگوں کی کوٹھیاں تھیں۔ جرمن بوڑھا گاڑی کو ایک کوٹھی کی طرف لے آیا۔ گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا۔ گاڑی دیکھ کر اس نے گیٹ کھول دیا۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد جرمن بوڑھے نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گیراج کی جانب سے ایک چھوٹا سا راستہ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف جاتا تھا۔ یہاں ایک بوڑھی جرمن عورت کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ دونوں اپنی زبان میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ بوڑھا بار بار میری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بوڑھی عورت کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے وہاں آنے سے گھبرا گئی ہے۔ وہ اخبار لپیٹ کر اندر چلی گئی۔ جرمن بوڑھا میری طرف دیکھ کر متوجہ ہوا اور انگریزی میں بولا۔

"میری بیوی کہتی ہے کہ تمہاری وجہ سے مکتی باہنی والے ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مگر میں تمہیں آگ اور خون کے اس دریا میں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میرے ساتھ اوپر آجاؤ۔"

دوسری منزل کے کونے میں برآمدے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سٹور روم تھا۔ جرمن بوڑھے نے کہا۔

"ابھی تم یہاں چھپ جاؤ۔ ہمارے تینوں نوکر بنگالی ہندو ہیں۔ ابھی تک ان میں سے کسی نے تمہیں نہیں دیکھا۔"

میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"چوکیدار نے مجھے دیکھ لیا ہے۔"

جرمن کہنے لگا۔

وہ کرسچن بنگالی ہے۔ میں اسے سمجھادوں گا کہ میرے بارے میں نوکروں سے کوئی ذکر نہ کرے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں شام تک اس چھوٹے سے کمرے میں ایک ٹوٹے ہوئے لوہے کے پلنگ پر بیٹھا رہا۔ جرمن بوڑھا دروازے کو تالا نہیں لگا کر گیا تھا۔ لیکن مجھے باہر نکلنے سے منع کر گیا تھا۔ نیچے صحن سے مجھے کبھی کبھی بنگالی نوکروں کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آجاتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھی میں صرف جرمن بوڑھا اور اسکی بیوی رہتے ہیں۔ باقی تینوں ملازم بنگالی ہیں۔

شام کو جرمن آگیا۔ وہ میرے لئے تھوڑا سا روسٹ ڈبل روٹی اور پانی لایا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارے علاقے میں ابھی مکتی باہنی والوں نے رخ نہیں کیا۔ مگر ڈھاکہ میں انڈیا کی فوج داخل ہوگئی ہے۔"

دور دور سے فائرنگ کی آوازیں مجھے مسلسل سنائی دیتی رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"کیا میں کسی طرح اپنے کزن کرنل صاحب تک نہیں پہنچ سکتا؟"

جرمن بوڑھا کہنے لگا۔

"تمہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ حالات کتنے سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ ملک بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ بنگالی ڈھونڈ ڈھونڈ کر غیر بنگالیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ تمہاری فوج بھارتی قید میں ہے۔ تم اپنے کزن کرنل کے پاس بھی نہیں پہنچ سکتے۔ خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو۔ جتنی دیر تک میں تمہیں یہاں چھپا سکتا ہوں چھپائے رکھوں گا۔ مگر میں تمہیں صاف صاف کہے دیتا ہوں اگر مکتی باہنی والے آگئے تو میں تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔"

میں نے دل میں اسی وقت سوچ لیا کہ یہ بوڑھا اگرچہ نیک دل ہے مگر ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند ہے' یہ میری جان بچا بھی سکتا ہے اور مجھے بڑی آسانی

سے موت کے حوالے بھی کر سکتا ہے اس لئے مجھے یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ رات میں نے اسی سٹور روم میں گزار دی۔ ساری رات شہر کی جانب سے فائرنگ اور نعروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ مجھے شاہد اور فیاض کا بھی خیال آتا کہ خدا جانے وہ کہاں ہوں گے۔ کس حال میں ہوں گے۔ خدا کرے کہ وہ جانیں بچا کر کسی طرف نکل گئے ہوں۔ مشرقی پاکستان میں میرا سوائے کرنل صاحب اور شاہد بٹ اور فیاض بٹ کے اور کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ میں کہاں جاتا؟ کیا کرتا؟ پنجابی پٹھان اور بہاری گھرانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ بار بار میرے دل میں ایک ہی خیال آتا کہ کسی طرح شہروں سے نکل کر جنگلوں کی طرف چلا جاؤں اور برما یا نیپال پہنچنے کی کوشش کروں۔ مگر یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ جنگل شہروں سے بہت دور تھے۔ میرے اور جنگلوں کے درمیان مکتی باہنی فورس کے درندے حائل تھے جو چن چن کر پنجابیوں' بہاریوں اور پٹھانوں کو قتل کر رہے تھے۔ میں نے جرمن بوڑھے کے آگے جب یہ تجویز پیش کی کہ وہ مجھے کسی طرح جنگل کے شمالی یا شمال مشرقی جنگلوں میں پہنچا دے۔ وہاں سے میں برما یا نیپال کی طرف فرار ہونے کی کوشش کروں گا تو وہ کہنے لگا۔

"جنگل یہاں سے ہزاروں میل دور ہیں۔ تمہیں پہلے چٹا گانگ جانا ہو گا۔ اور یہ راستہ محفوظ نہیں ہے۔ راستے میں بنگالی گاڑیاں روک کر ڈبوں میں سے پنجابی' بہاری اور پٹھان مسافروں کو کھینچ کر باہر نکال لیتے ہیں اور پلیٹ فارم پر ہی انہیں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اگر تم کسی طرح چٹا گانگ پہنچ بھی جاؤ تو تمہیں وہاں سے بھی آگے کافی دور تک سفر کرنا پڑے گا۔ پھر جنگل شروع ہو جائے گا۔ لیکن ان جنگلوں میں مکتی باہنی فورس والوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے ہیں۔ اور اب تو انڈین فوج بھی وہاں آگئی ہوئی ہے۔ اس خیال کو دل سے نکال دو۔۔۔۔۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے کہا: "تو پھر میں کدھر جاؤں؟ میں مکتی باہنی والوں کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا۔"

جرمن بوڑھا میرے سامنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ کہنے لگا:

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔"

میں بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا:

"ڈھاکہ شہر کے جنوب میں دریائے بوڑھی گنگا کے دوسرے کنارے پر میرے ایک جرمن دوست نے چھوٹا سا ملک پلانٹ لگا رکھا ہے۔ اس کا ٹرک ہفتے میں ایک بار دودھ کے ڈبے لے کر چٹاگانگ جاتا رہتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہیں چٹاگانگ پہنچایا جا سکتا ہے۔"

میں نے عاجزی سے کہا:

"سر پلیز! مجھے اپنے دوست کے پاس پہنچا دیں۔ آگے جو میری قسمت میں لکھا ہے' وہ میں بھگت لوں گا۔"

جرمن بوڑھا بولا: "میں اس سے ٹیلی فون پر بات کرتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا:

"تم بیوقوف ضرور ہو لیکن قسمت خود تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔ میرے دوست نے تمہیں چٹاگانگ پہنچانے کی حامی بھر لی ہے۔ آج رات تمہیں اپنے دوست کے پلانٹ پر پہنچا دوں گا۔"

اس نے مجھے بتایا کہ اس کے جرمن دوست کا نام اوٹو ہے اور مشرقی پاکستان میں گڑبڑ شروع ہوتے ہی اس نے اپنی فیملی جرمنی پہنچا دی تھی اور اب وہ وہاں اکیلا رہتا ہے۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ شاید اس جہنم سے میرے نکلنے کا کچھ بندوبست ہو جائے۔ دوپہر کو گلشن کے علاقے میں بھی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سٹور

روم میں ہی بند تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ بقول جرمن بوڑھے کے ابھی تک اس کے بنگالی نوکروں کو میرا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ فائرنگ سٹین گنوں کی تھی۔

تھوڑی دیر میں جرمن بوڑھا میرے پاس آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا:

"مکتی باہنی والے یہاں بھی آ گئے ہیں۔ یہاں کچھ کوٹھیاں پنجابیوں کی تھیں۔ وہ لوگ بھاگ چکے ہیں۔ بنگالی ان کی کوٹھیاں لوٹ رہے ہیں۔ تم یہاں سے باہر مت نکلنا۔"

وہ چلا گیا۔ میں سہم کر وہیں بیٹھ گیا۔ میرے کان باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازوں پر لگے تھے۔ ایک دو گھنٹے تک یہ شور سنائی دیتا رہا۔ پھر آوازیں دور چلی گئیں۔ جرمن بوڑھے نے مجھے آ کر بتایا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔

"میں تمہیں رات کو یہاں سے لے چلوں گا۔ تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں اب اپنی مصیبت اپنے دوست اوٹو کے سر پر ڈال رہا ہوں۔ میں بزدل آدمی ہوں۔ شاید اس لئے کہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اوٹو بوڑھا نہیں ہے۔ وہ تمہیں چٹاگانگ کے جنگلوں میں ضرور پہنچا دے گا۔ آگے تمہاری قسمت ہے۔"

اس نیک دل بوڑھے جرمن نے میرے ساتھ جو انسانی ہمدردی کا سلوک کیا' وہ میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اگر اس کے بنگالی نوکر یا کوئی دوسرا شخص میری مخبری کر دیتا کہ اس جرمن آدمی نے ایک پنجابی اپنی کوٹھی میں چھپایا ہوا ہے تو مکتی باہنی والوں نے مجھے تو شوٹ کرنا ہی تھا مگر اس بوڑھے جرمن جوڑے کو بھی وہ زندہ نہ چھوڑتے اور اس کی کوٹھی کا سامان لوٹ کر آگ لگا دیتے۔ اس وقت جو کوئی کسی بہاری' پنجابی یا پٹھان کو پناہ دیتا تھا' بنگالی اسے بھی قتل کر ڈالتے۔ ایسے واقعات ڈھاکہ میں ہوئے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو جرمن بوڑھا بڑی خاموشی سے دروازہ کھول کر میرے پاس آیا۔ کہنے لگا:

"چلو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھے کوٹھی کے پچھلے دروازے سے نکال کر لے گیا۔ عقبی حصے میں چھوٹی سی سڑک دو رویہ کوٹھیوں کے پچھواڑے میں تھی۔ یہاں اس نے گاڑی پہلے سے کھڑی کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹنے کے لئے کہا۔ میں لیٹ گیا۔ اس نے میرے اوپر چادر ڈال دی اور اوپر تین چار تکئے اور پرانے کپڑے رکھ دیئے۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

کافی دیر تک گاڑی ڈھاکہ شہر کی سڑکوں پر چلتی رہی۔ کبھی دائیں طرف گھوم جاتی۔ کبھی بائیں طرف۔ شاید وہ لمبا چکر لگا کر محفوظ علاقوں میں سے گذر رہا تھا۔ کسی کسی جگہ باہر سڑک پر لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ایک جگہ گاڑی کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ جرمن بوڑھے نے کہا:

"خبردار آواز نہ نکالنا۔ آگے کچھ لوگ گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔
"

میرا دل خوف کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سمجھ گیا کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی ہے۔ اب اگر زندگی باقی ہو گی تو بچ سکوں گا۔ گاڑی رک گئی۔ کسی نے گاڑی پر دو تین ڈنڈے مارے۔ کسی نے پہلے بنگلہ پھر انگریزی میں پوچھا:

"کون ہو؟ رات کے وقت کہاں جا رہے ہو؟"

جرمن بوڑھے نے بڑے اعتماد کے ساتھ اور زوردار آواز میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا:

"میں جرمن ایمبیسی کا آدمی ہوں۔ تمہارے بنگلہ دیش کے لئے ہمارے نئے سفیر جرمنی سے آئے ہیں۔ ان کی دعوت پر جا رہا ہوں۔"

بنگالیوں کی آوازیں کچھ نرم پڑ گئیں۔ اسی بنگالی نے انگریزی میں پوچھا:

"پیچھے کیا ہے؟"

جرمن بوڑھے نے کہا: "یہ میرے نوکر کا بستر اور تکئے ہیں۔ اس کے لئے لے کر جا رہا ہوں۔ چلو تم لوگ بھی ہماری پارٹی میں چلو۔ ہم سب بنگلہ دیش بننے کا جشن منائیں گے۔"

بنگالی نے خوش ہو کر کہا: "تھینک یو سر۔ تھینک یو۔ یو کین گو۔۔"

میری جان میں جان آئی۔ اس وقت اگر تکئے اور چادریں ہٹا کر کوئی دیکھتا تو نیچے میں پڑا تھا۔ اس کے بعد میری اور میرے محسن جرمن بوڑھے کی خیر نہیں تھی۔ دوسرے لمحے یقینی طور پر ہماری لاشیں سڑک پر پڑی ہوتیں۔ لیکن ابھی ہماری زندگی باقی تھی کہ جرمن بوڑھے نے کمال حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ گاڑی آگے بڑھی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد جرمن بوڑھے نے کوئی بات نہ کی۔ لگتا تھا کہ اسکی ساری توجہ گاڑی چلانے اور محفوظ راستہ تلاش کرنے پر لگی ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آواز آئی:

"خدا نے ہمیں بچا لیا تھا۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ میری بات کا جواب مت دینا۔ ہم اس وقت دریائے بوڑھی گنگا کے پل پر سے گذر رہے ہیں۔ دوسرے کنارے پر میرے دوست اوٹو کا ملک پلانٹ ہے۔۔۔۔"

میں خاموش اور مطمئن تھا۔ گاڑی نے دو ایک موڑ مڑے اور پھر اس کا ہارن دوبار بجا۔ گاڑی رک گئی۔ مجھے گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی اور گیٹ کے اندر چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ جرمن بوڑھے نے اپنے جرمن دوست اوٹو کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہہ دیا ہوا تھا کہ وہ گیراج کا گیٹ بھی کھلا رکھے۔ گاڑی بڑی آہستہ آہستہ چلتی گیراج میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ جرمن بوڑھے نے کہا:

"ہم اوٹو کے پلانٹ میں آ گئے ہیں ملب بے شک باہر نکل آؤ۔"

میں چادریں تکئے ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا کہ گاڑی ایک اونچی چھت والے گیراج میں کھڑی تھی۔ گیراج کا دروازہ بند تھا۔ جرمن بوڑھا بولا:

"اس طرف سے آ جاؤ۔"

گیراج کے اندر ایک چھوٹا دروازہ تھا جس میں سے کوٹھی کے اندر راستہ جاتا تھا۔ یہ ساری حکمت عملی اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ پلانٹ کے چوکیدار کو علم نہ ہو سکے کہ گاڑی میں کسی کو چھپا کر پلانٹ میں لایا گیا ہے۔ چوکیدار بنگالی تھا۔ ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہاں ایک چالیس پینتالیس سال کی عمر کا ورزشی جسم والا اونچا لمبا جرمن ہمارے خیر مقدم کو موجود تھا۔ اس کے سنہری بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ سگار پی رہا تھا۔ اس نے جرمن بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور جرمن زبان میں کوئی بات کی۔ پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور انگریزی میں پوچھا:

"تم انگریزی بول لیتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ تھوڑی تھوڑی بول لیتا ہوں۔"

کمرہ بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس آدمی کا نام اوٹو تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"تم چٹا گانگ کے جنگل کی طرف کیوں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ جان بچانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔ یہ جنگل سرحد پر ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ وہاں سے برما کی طرف نکل جاؤں۔"

اوٹو کہنے لگا۔ "تم ان جنگلوں سے واقف نہیں ہو۔ یہ دنیا کے خطرناک جنگلوں میں سے ہیں اور پھر وہاں کوئی ایسا راستہ بھی نہیں ہے جو سیدھا برما کی سرحد کی طرف جاتا ہو، تم بھٹک جاؤ گے اور کسی شیر کا شکار ہو جاؤ گے۔ ان جنگلوں میں دلدلیں ہیں جن میں ہاتھی غرق ہو جاتے ہیں۔ زہریلے سانپ ہیں۔ جنگلی لوگ ہیں جو مسافروں کو پکڑ لیتے ہیں اور ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر ان سے مویشیوں کی طرح کام لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں چٹا گانگ کی بندرگاہ سے کسی جہاز میں سوار ہو کر رنگون چلا جاؤں یا کسی جزیرے کی طرف نکل جاؤں؟"

اوٹو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم خواب ایسی باتیں کر رہے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ چٹا گانگ کی بندرگاہ پر چاروں طرف انڈین نیوی کے جنگی جہاز کھڑے ہیں۔ وہاں سے کوئی مسافر بردار جہاز روانہ نہیں ہو رہا۔ تم بندرگاہ پر پکڑ لئے جاؤ گے اور بھارتی نیوی کے آدمی تمہیں مکتی باہنی کے حوالے کر دیں گے۔ وہ یہی کرتے ہیں۔"

میں سخت مایوسی کے عالم میں چپ سا ہو گیا۔ جرمن بوڑھے نے انگریزی میں اوٹو سے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس لڑکے کو نیپال سرحد پر پہنچا دیا جائے؟"

اوٹو نے کہا۔ "نیپال کی سرحد یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ راستے میں کئی دریا، کئی ندیاں پڑتی ہیں جہاں مکتی باہنی فورس اور بھارتی کمانڈو فورس کے آدمی پنجابیوں، بہاریوں اور پٹھانوں کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ وہاں تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اوٹو نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"صرف ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ میں اسے چٹاگانگ کی بجائے کسی طرح کاکسز بازار پہنچادوں۔ وہاں سے برما کی سرحد قریب ہے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"کیا تم نے پہلے کبھی جنگل دیکھے ہیں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں! بمبئی کے جنگلوں میں ایک شکاری کے ساتھ کچھ دن پھرتا رہا ہوں۔"

اوٹو نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"کل ہمارا ایک ٹرالر مال لے کر چٹاگانگ جا رہا ہے۔ میں تمہیں اپنے ڈرائیور کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تمہیں چٹاگانگ سے آگے کاکسز بازار پہنچا دے گا۔ اس کے آگے برما کی سرحد تک تمہیں خود سفر کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا: "کہیں ڈرائیور راستے میں مجھے مکتی باہنی والوں کے حوالے تو نہیں کر دے گا؟؟"

اوٹو نے کہا: "ایسی بات نہیں ہو گی۔ میرا ڈرائیور عیسائی بنگالی ہے اور قابل اعتماد آدمی ہے۔ تم اسکی فکر نہ کرو۔"

وہ رات میں نے اوٹو کے پلانٹ پر ایک چھوٹے سے کمرے میں گذاری۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت ایک کافی بڑے ٹرک میں دودھ کے بڑے بڑے کین لادے جا رہے تھے۔ یہ ٹرک فیکٹری میں ایک گودام کے اندر کھڑا تھا۔ اس میں خشک دودھ سے بھرے ہوئے بڑے بڑے ڈبوں اور کین کے درمیان لیٹنے کے لئے ایک خفیہ جگہ بنادی گئی تھی۔ وہاں مجھے لٹادیا گیا۔ اوٹو اور جرمن بوڑھے نے مجھے کچھ پیسے بھی دیئے۔ کرسچین ڈرائیور کو اچھی طرح سے سمجھادیا گیا۔ اس کے بعد ٹرک فیکٹری کے گیٹ سے نکل کر چٹاگانگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ کافی لمبا سفر تھا۔ شام تک ٹرک چلتا رہا۔ ہم ڈھاکہ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میں ڈبوں اور کین کے نیچے پڑا تھا۔ مجھے تھوڑا تھوڑا آسمان نظر آرہا تھا۔ ڈھاکہ سے نکلتے وقت ایک چیک پوسٹ پر ٹرک کو روک کر چیک بھی کیا گیا۔ مگر کسی نے دودھ کے بڑے بڑے ڈبے اور کین اٹھا کر نیچے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ شام کا اندھیرا ہونے لگا تو ڈرائیور نے ایک جگہ ٹرک روک لیا۔ اس نے چند کین اٹھا کر مجھے باہر آجانے کو کہا۔ میں باہر آگیا۔ ڈرائیور کہنے لگا:

"بھارتی فوج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ پاکستان کی فوج اب بھی کہیں کہیں لڑ رہی ہے۔ کومیلا پہنچ کر پورے حالات معلوم ہوں گے۔"

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یہاں ہم نے کھانا کھایا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ آدھی رات کو کوئی شہر آیا۔ ڈرائیور نے جسکا نام پرسی تھا' ٹرک سڑک کی ایک جانب کھڑا کر دیا۔ مجھے اس نے وہیں رہنے کو کہا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانا لے کر آگیا۔ کہنے لگا:۔

"میں نے کھانا کھالیا ہے۔ تم بھی کھالو۔"

پیچھے ہمیں کسی جگہ سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ اس وقت دور سے توپوں کی ہلکی ہلکی گونج سنائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور پرسی کہنے لگا:

"یہ آواز سن رہے ہو؟ یہ مارٹر توپوں کی فائرنگ کی آواز ہے۔ اسکا مطلب ہے کہ پاکستانی فوج اپنی پوزیشنوں میں ڈٹی ہوئی ہے۔ مفاد پرست کمینے سیاستدان ملک کو لے ڈوبے ہیں۔ میں نے خود بھارتی فوجیوں کو کہتے سنا ہے کہ ہمیں یقین ہی نہیں آسکتا تھا کہ مشرقی پاکستان کی فوج ہتھیار ڈال دے گی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ہتھیار حرامزادے سیاستدانوں نے ڈالے۔ پاک فوج کے جوان جہاں جہاں مورچوں میں ہیں' دشمن کے خلاف لڑ رہے ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے پر میرا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ ہمیں سیاست دانوں نے مروا دیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر وہاں آرام کیا۔ ہم ٹرک کی اوٹ میں درختوں کی سائیڈ پر بیٹھے تھے۔ ڈرائیور پرسی نوجوان لڑکا ہی تھا مگر بڑا ماہر ڈرائیور تھا اور مشرقی پاکستان کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے ایک سگریٹ پیا۔ ایک سگریٹ مجھے دیا۔ ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہم دن نکلنے کے بعد کومیلا پہنچیں گے۔

باقی کی رات سوتے ہوئے گذر گئی۔ پرسی کے کہنے کے مطابق راستے میں دو جگہوں پر انڈیا کی فوج نے چیک کیا اور ٹرک میں دودھ کے ڈبے اور کین لدے ہوئے دیکھ کر آگے جانے کی اجازت دے دی۔ دوسرے دن کوئی دس بجے کے قریب ہم کومیلا پہنچ گئے۔ پرسی نے شہر سے باہر ہی ٹرک کو ایک طرف لگا دیا۔ میں اس کا اشارہ پا کر ڈبوں کے نیچے سے نکل آیا۔ میں نے اسے کہا:

"میرا خیال ہے اب زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ ہم ڈھاکے سے بہت دور آ گئے ہیں۔ میں باہر نکل کر تمہارے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرتا ہوں۔"

پرسی کہنے لگا: "یہ غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ چٹا گانگ تک تمہاری جان خطرے میں ہے۔ ان تمام شہروں میں پنجابیوں' بہاریوں اور پٹھانوں کو جگہ جگہ قتل کیا جا رہا ہے۔ بس جہاں لیٹے ہو' اسی طرح لیٹے لیٹے سفر کرتے جاؤ' صرف ایک رات کی بات ہے۔ ہم پرسوں چٹا گانگ میں ہوں گے۔ آگے ایک جگہ ہمیں کشتی میں سفر کرنا ہو گا۔"

میں نے پوچھا: "کیا ہم ٹرک چھوڑ کر کشتی میں بیٹھیں گے؟"

پرسی نے کہا: "نہیں۔ ٹرک سمیت کشتی میں سوار ہوں گے۔ یہ کشتی بہت بڑی ہو گی۔ ہمیں دریا پار کرتے ایک گھنٹہ لگے گا۔"

کومیلا شہر کے مکان اور بازار مجھے دور سے نظر آ رہے تھے۔ فوجی گاڑیاں سڑک پر سے گذر رہی تھیں۔ جگہ جگہ بنگلہ دیش کے پرچم لہرا رہے تھے۔ یہاں سے ہم آگے چلے تو ایک جگہ دریا آ گیا۔ یہاں ایک بڑی جہازی سائز کی کشتی پر ٹرک اتر گیا۔ ایک گھنٹے میں دریا پار کر کے ہم لکشم گھاٹ پہنچے۔ اس کے بعد زم گھاٹ اور نزیر گھاٹ شہروں سے ہوتے ہوئے سڑک پر چٹا گانگ کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

رات میں کسی وقت میں ڈبوں کے نیچے سے نکل کر اب پرسی کے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ دن کی روشنی ہونے لگتی یا کوئی چیک پوسٹ آ جاتی تو ڈبوں کے نیچے اپنی جگہ پر جا کر چھپ جاتا۔ نذیر گھاٹ سے آگے چٹا گانگ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک جگہ دریا کی شاخ بہت بڑی ندی کی شکل میں گذرتی ہے جس کے اوپر پل بنا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے دور سے دیکھ لیا کہ پل پر انڈین فوجی اور کچھ بنگالی کھڑے ہیں۔ اس نے ٹرک ایک طرف کر کے روکا اور مجھے پیچھے آ کر آواز دے کر کہا:

"آگے کچھ انڈین فوجی اور مکتی باہنی والے کھڑے ہیں۔ میں ان سے بات کر لوں گا۔ تم کوئی حرکت نہ کرنا۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹرک آگے بڑھا دیا۔ مجھے فکر لگ گئی کہ خدا جانے یہ کس قسم کی چیکنگ ہے کہ ڈرائیور نے خود آ کر مجھے خبردار کیا ہے۔ دور ہی سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے وہ لوگ ٹرک کو رکنے کا کہہ رہے ہوں۔ ٹرک کی رفتار ہلکی ہو گئی اور پھر وہ بائیں طرف سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ مجھے فوجی بوٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی فوجی نے پوچھا کہ ٹرک میں کیا لدا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے کہا: "سر!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دودھ کے ڈبے ہیں۔ چٹاگانگ لے جا رہا ہوں۔ ڈھاکہ میں جرمن فیکٹری سے لایا ہوں۔"

دو تین آدمیوں نے اونچی آوازوں میں بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ فوجی کی آواز آئی۔ "چلو تلاشی دو۔"

یہ سن کر میری جان ہوا ہو گئی۔ مگر سوائے ڈبوں کے نیچے پڑے رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بس دل میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ وہ لوگ پیچھے آ گئے تھے اور میرے اوپر سے ڈبے اٹھائے جانے لگے۔ تین چار بڑے ڈبے اور دو تین کین اٹھانے کے بعد نیچے سے میں نکل آیا۔

"باہر نکلو۔"

بنگالی شور مچانے لگے:

"پنجابی ہے' پنجابی ہے.... پکڑ لو اسے۔"

میں باہر نکل آیا۔ دن کا وقت تھا۔ میں نے چار پانچ بھارتی مسلح فوجی دیکھے۔ ان کے ارد گرد چھ سات بنگالی ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھرے لئے شور مچا رہے تھے اور مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھارتی فوجی نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کیا اور بنگالیوں سے کہا:

"ٹھہر جاؤ۔ پہلے ہمیں انٹیروگیشن کرنے دو۔"

اس فوجی نے مجھ سے پوچھا:

"کون ہو تم؟ کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے کہا: "میں بنگالی نہیں ہوں سر۔ ڈھاکے سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ یہ ٹرک ایک جگہ کھڑا تھا۔ اس میں چھپ کر لیٹ گیا۔ ڈرائیور کو بھی نہیں بتایا۔"

اس سے پہلے ہی ڈرائیور بھی یہی بیان دے چکا تھا کہ مجھے نہیں معلوم یہ آدمی یہاں کیسے آ گیا ہے۔ فوجی بولا:

"ٹھیک ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ کمانڈ پوسٹ چلنا ہو گا۔ تم پنجابی پاکستانی ہو---"

جب فوجی مجھے پکڑ کر دور کھڑی جیپ کی طرف لے کر چلا تو بنگالیوں نے ہنگامہ شروع کر دیا اور کہا کہ اس پنجابی کو ہمارے حوالے کرو۔ یہ ہمارا قیدی ہے۔ ہم اسے پکڑ کر اپنے کمانڈر کے پاس لے جائے گا۔ میں سمجھ گیا کہ مکتی باہنی فورس کے آدمی ہیں اور اب میرا بچنا مشکل ہے۔ میں نے انڈین فوجی سے کہا:

"سر! مجھے ان کے حوالے نہ کریں۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

بھارتی فوجی نے مکتی باہنی والوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ان لوگوں پر خون سوار تھا۔ انہوں نے زبردستی میرا بازو پکڑ کر مجھے بھارتی فوجی سے چھین لیا اور گھسیٹتے ہوئے سڑک پر دریا کی شاخ والے پل کی طرف لے گئے۔ وہ مجھے پکڑ کر تیز تیز دوڑاتے اور بنگلہ زبان میں شاید پنجابیوں کو گالیاں دیتے تھپڑ مارتے لئے جا رہے تھے۔ میرے پیچھے بھی مکتی باہنی کے بنگالی لگے ہوئے تھے اور چھرے لہرا لہرا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں بدحواس ہو گیا تھا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ کبھی ایک طرف دیکھا' کبھی دوسری طرف دیکھتا۔ وہ مجھے پکڑ کر دریا کے پل پر لے آئے۔

ایک بنگالی نے کچھ کہا۔ دوسرے نے اس کے جواب میں کچھ کہا۔ انہوں نے مجھے پل پر کھڑا کر دیا۔ دو بنگالی چھرے لہراتے ہوئے مجھے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ میں ذرا پیچھے ہوا تو ایک بنگالی نے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ وہ مجھے قابو کر رہا تھا اور دونوں بنگالی چھرے لئے میرے اوپر آ گئے۔ اس وقت نہ جانے میرے جسم میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ میں نے زور سے جھٹکا دیا۔ جس بنگالی نے میری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں' وہ میرے جھٹکے سے دور جاگرا۔ ایک لمحے کے لئے میں آزاد تھا۔ بس یہی زندگی اور موت کے درمیان کا لمحہ تھا۔ میں بجلی کی طرح زمین پر سے اٹھا اور میں نے اپنے آپ کو پل پر سے نیچے دریا میں گرا دیا۔

دریا میں گرتے ہی میں نے غوطہ لگالیا۔ اوپر پل پر ایک شور مچ گیا۔ فائرنگ کے دھماکے ہوئے۔ میں پانی کے اندر تھا اور جتنی تیزی سے آگے کی طرف پانی کے اندر رہ کر تیر سکتا تھا' تیرتا چلا گیا۔ اگر میرا سر پانی سے باہر ہوتا تو گولیاں میرا بھیجا اڑا چکی ہوتیں۔ بھارتی فوجیوں نے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ مگر قدرت نے مجھے بچانا تھا۔ گولیاں میرے آگے پیچھے دائیں بائیں پانی کو چیرتی ہوئی نیچے جا رہی تھیں۔ میں نے غوطہ لگا رکھا تھا اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ پانی کے اندر ہی اندر چلا جا رہا تھا۔ تیرنا میں نے بچپن میں ہی سیکھ لیا تھا۔ اپنے شہر کی نہروں پر میں پل پر سے چھلانگیں لگایا کرتا تھا اور مجھے پانی کے اندر کافی دیر تک غوطہ لگانے کی کافی پریکٹس تھی۔ اس وقت میرے سامنے موت کھڑی تھی۔ میں جتنی دیر سانس روک سکتا تھا' اس سے زیادہ دیر تک سانس کو روک کر دریا میں کافی آگے نکل گیا۔ فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ شاید وہ لوگ یہ سمجھے تھے کہ میں ڈوب کر مر چکا ہوں۔ کیونکہ وہاں دریا کے پانی میں بڑے بھنور پڑ رہے تھے۔ اگرچہ یہ دریا کی ایک شاخ تھی مگر اس کا بہاؤ بڑا تیز تھا اور پانی گھومتا ہوا بہہ رہا تھا۔ یہ بات میرے حق میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔

جب میرا سانس گھٹنے لگا تو میں نے سر باہر نکال لیا۔ میرا منہ کھلا تھا۔ میں بری طرح سانس لے رہا تھا۔ میں نے پانی میں چکر کھاتے ہوئے اور ٹانگیں چلاتے ہوئے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ پل کافی دور رہ گیا تھا۔ وہاں مجھے دور سے کچھ لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ مگر شاید میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کنارے کے دونوں جانب کافی فاصلے پر تھے۔ ایک طرف درخت ہی درخت تھے۔ دوسرے جانب درختوں میں کچھ مکان

بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے وہاں دریا سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ تیرنا شروع کر دیا۔ دریا کا تیز پانی مجھے تیزی سے آگے لئے جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے میں کافی دور نکل گیا۔ یہاں دریا کا پاٹ چوڑا ہونے لگا تھا۔ شاید دریا کی یہ شاخ ایک دریا سے نکل کر کسی دوسرے دریا میں گر رہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں بڑے دریا تھے۔ ندیاں تو بے شمار تھیں۔ میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ دل میں یہی ڈر لگا ہوا تھا کہ دریا سے باہر نکلا تو بنگالی مجھے پکڑ کر مار ڈالیں گے۔

اب میں واقعی کسی دوسرے علاقے میں آ گیا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ماہی گیروں کی تین چار کشتیاں نظر آئیں۔ ان کی طرف جانا موت کے منہ میں جانے کے برابر تھا۔ میں آہستہ آہستہ دریا کے اس کنارے کی طرف ہٹنے لگا جدھر درختوں کے جھنڈ کنارے کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی جنگل ہے۔ میں اس جنگل میں چھپ جاؤں گا۔ ان درختوں میں ناریل اور تاڑ کے درختوں کو میں پہچان لیتا تھا۔ تیرتے تیرتے آخر میں کنارے پر آ گیا۔ یہاں بے شمار سرکنڈے اور جھاڑیاں دریا کے کنارے کنارے اگی ہوئی تھیں۔ جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر میں اونچے کنارے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میرے کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے تھے۔ جرمن بوڑھے اور مہربان اوتو نے مجھے جو نوٹ دیئے تھے' وہ بھی گیلے ہو گئے تھے۔ میں نے گیلے نوٹ نکال کر اسی طرح دھوپ میں گھاس پر ڈال دیئے۔ قمیض اتار کر نچوڑی اور اسے بھی گھاس پر ڈال دیا۔ اس دوران میں چاروں طرف بڑے غور سے ماحول کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ وہاں درختوں کے پیچھے بھی درخت ہی درخت تھے اور یہ سلسلہ کافی دور تک چلا گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں سے چٹاگانگ کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ دل میں خوش ہوا کہ میری منزل قریب آ رہی ہے۔ جان بچ جانے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب سے بڑی مصیبت اور مشکل یہ تھی کہ میں نہ بنگالی بول سکتا تھا' نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہی ایک بات مجھے غیر بنگالی ثابت کرنے کے لئے کافی تھی اور اس وقت مشرقی پاکستان غیر بنگالیوں کا مقتل بنا ہوا تھا۔ مگر یہ میری ایسی مجبوری تھی جس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے کچھ فاصلے پر مجھے ایک بنگالی جاتا دکھائی دیا۔ اس نے میری طرف بھی دیکھا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں پریشان ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ آدمی جاکر مکتی باہنی کو خبر کر دے گا کہ ادھر دریا پر ایک پنجابی بیٹھا ہے۔ میں گیلی قمیض اٹھا کر جلدی جلدی پہنی۔ گیلے نوٹوں کو جوڑ کر جیب میں ڈالا اور کنارے سے اتر کر سامنے والے درختوں کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ بہت جلد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی گھنا جنگل نہیں ہے۔ ایک جانب درختوں میں سے دور کچھ مکان دکھائی دے رہے تھے۔ جہاں سے میں گزر رہا تھا وہاں کہیں کھلی جگہ آ جاتی کہیں جھاڑیاں شروع ہو جاتیں اور کہیں ناریل کے ٹیڑھے درخت آ جاتے۔ بارشوں کا موسم نہیں تھا۔ گڑھے خشک تھے۔ چلتے چلتے میں ایک جگہ درختوں سے باہر نکلا تو ایک جھونپڑی نظر آئی۔ میں سوچنے لگا کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ کیونکہ بات کرتے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ میں بنگالی نہیں ہوں۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہاں کوئی محب وطن مسلمان بنگالی رہتا ہو۔ اس سے پوچھتا ہوں کہ آگے راستہ کدھر جاتا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہر بنگالی غیر بنگالی کا دشمن نہیں تھا۔ مسلمان بنگالیوں کی اکثریت محب وطن پاکستانی تھی۔ میں نے مسلمان بنگالیوں کو سقوط ڈھاکہ پر بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو مسلمان بھارت کی بھیجی ہوئی مکتی باہنی فورس کے ہندوؤں کے ساتھ مل گئے تھے انہیں ورغلایا گیا تھا اور ان پر بھارت کے اس جھوٹے پراپیگنڈے کا اثر تھا کہ پنجابیوں' پٹھانوں اور بہاریوں نے فوج کے ساتھ مل کر بنگالیوں پر بڑا ظلم کیا ہے اور دس لاکھ بنگالیوں کو ہلاک کیا ہے۔ حالانکہ یہ محض جھوٹ تھا۔ مگر وہ حالات ایسے پیدا ہو

گئے تھے یا پیدا کر دیئے گئے تھے کہ مسلمان بنگالیوں کی کچھ تعداد بھی ہندو بنگالیوں کی ساتھ مل گئی تھی۔

میں پچھلی طرف سے جھونپڑی کی طرف بڑھا۔

یہ گھاس پھونس کی جھونپڑی تھی۔ ایسی جھونپڑیاں مشرقی پاکستان کے دیہات' قصبوں اور شہروں کے باہر کھیتوں میں عام دیکھی جاتی ہیں۔ جھونپڑی پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا جھونپڑی کے دروازے کی طرف آیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جھونپڑی کے باہر دو لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ ایک لاش بوڑھے مرد کی تھی جبکہ دوسری لاش بوڑھی عورت کی تھی۔ دونوں کی گردنیں آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھیں اور خون جم گیا تھا۔ ان کی گردنوں پر چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔

میں خوف کے مارے وہاں سے جلدی جلدی آگے چلا گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے ایک سفید بالوں والے پتلے دبلے آدمی کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے گلے میں میلا کچیلا صافہ پڑا تھا جس سے وہ بار بار آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔ میں اس کے پاس آ گیا۔ میں نے بنگلہ اردو میں اس سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اس نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا اور سر جھکا کر رونے لگا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اس آدمی سے مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ میں نے دو تین بار اس سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ پیچھے جو دو لاشیں گری ہوئی ہیں وہ اس آدمی کے عزیزوں کی لاشیں ہیں۔ بوڑھے آدمی نے کچھ اردو اور کچھ بنگالی میں مجھے جو واقعہ سنایا وہ میں آپ کو اپنی زبان میں سنا رہا ہوں۔ یہ بوڑھا بنگالی ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ اپنے بڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھائی سے ملنے یہاں آیا ہوا تھا جو پیچھے جھونپڑی میں اپنی بیوی اور جوان بہو کے ساتھ رہتا تھا۔ اسکا بیٹا ڈھاکہ مزدوری کرنے گیا ہوا تھا کہ ڈھاکہ فال ہو گیا اور مکتی باہنی کے ہندوؤں نے لوٹ مار اور عورتوں کو اغوا کرنا شروع کر دیا۔ بھارت کے بھیجے ہوئے یہ ہندو بنگالی مسلمان بنگالیوں کی عورتیں بھی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ چنانچہ آج صبح مکتی باہنی والے یہاں بھی آ گئے۔ اس وقت دونوں بوڑھے بنگالی بوڑھی عورت اور بہو کے ساتھ جھونپڑی میں موجود تھے۔ مکتی باہنی والوں نے آتے اس بنگالی کے بڑے بھائی اور بیوی کی گردنوں پر سنگینیں ماریں اور جوان بہو کو اٹھالیا۔ یہ بنگالی بوڑھا وہاں سے جان بچا کر بھاگ گیا۔ مکتی باہنی والے جوان مسلمان بہو کو اٹھا کر لے گئے۔

بوڑھا بنگالی سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہم نے ایسی آزادی تو نہیں مانگی تھی۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہندو ہماری بیٹیوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ ہماری عورتوں کو قتل کر ڈالیں گے۔"

وہ روئے جا رہا تھا۔ جب میری باتوں سے ذرا اس کی طبیعت سنبھلی تو بولا۔

"بیٹا! تم میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنے بھائی اور بھاوج کی لاشیں دفن کرنا چاہتا ہوں۔ میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔"

میں اس کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ ہم نے ایک طرف درختوں میں دو گڑھے کھودے۔ دونوں لاشوں کو ساتھ ساتھ دفن کر کے اوپر قبریں بنالیں۔ ہم نے قبروں پر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی۔ بوڑھا بنگالی وہیں بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کون ہوں بہاری ہوں یا پنجابی؟ میں نے اسے بتا دیا کہ میں پنجابی ہوں۔ پھر اسے اپنی ساری کہانی بیان کر دی۔ وہ سر جھکائے غور سے میری بات سنتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں سے چٹا گانگ کی طرف کونسا راستہ میرے لئے ٹھیک رہے گا۔"

جب اسے معلوم ہوا کہ میں کاکسز بازار کی طرف سے جنگل پار کر کے برما کی سرحد پر پہنچنا چاہتا ہوں تو وہ کہنے لگا۔

"بیٹا! کاکسز بازار کے آگے جنگل بڑے خراب ہیں۔ خطرناک بھی ہیں۔ شیر، بھالو، ہاتھی، سانپ بہت ہیں۔ تم بھٹک جاؤ گے۔"

میں نے پوچھا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ میں ڈھاکہ واپس نہیں جا سکتا۔ وہاں بلکہ مشرقی پاکستان کے ہر شہر میں مکتی باہنی والے پنجابیوں کا قتل عام شروع کر دیا ہے۔"

بوڑھا بنگالی صافے سے آنکھیں پونچھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"تم جس طرف جاؤ گے تمہارے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ مکتی باہنی والوں سے بچو گے تو کوئی ہندو تمہیں مار ڈالے گا۔ اس سے بچو گے تو انڈیا کے فوجی تمہیں پکڑ لیں گے۔"

میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں۔ یہاں بھی ٹھہر نہیں سکتا۔"

بوڑھا بنگالی کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ یہاں کسی شہر میں کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر بیٹھ جاؤ۔ جب حالات ذرا ٹھیک ہو جائیں پھر جہاں چاہے نکل جانا۔"

میں نے کہا۔

"مجھے تو ایسی کوئی محفوظ جگہ نظر نہیں آتی۔ ہر جگہ میری جان کو خطرہ ہو گا"۔

بوڑھا بنگالی کہنے لگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تم ایسا کرو بیٹا کہ میرے ساتھ چاند پور چلو۔ وہاں ایک مولوی صاحب میرے بڑے پرانے دوست ہیں۔ بڑے محب وطن پاکستانی ہیں۔ میں انہیں ساری بات بتادوں گا۔ وہ تمہیں ضرور کسی نہ کسی جگہ چھپالیں گے۔ ان کا نام مولوی کبیردین ہے۔"

میرے لئے یہ تجویز اس وقت انتہائی غنیمت تھی۔ کیونکہ ہر طرف موت منہ پھاڑے نظر آرہی تھی۔ کسی بھی جگہ کسی بھی کھیت' میدان یا شہر کے کسی بازار میں مجھے قتل کیا جاسکتا تھا۔ میں نے جب پوچھا کہ ہم چاند پور کس طرح جائیں گے۔ تو وہ بولا۔

"ریل گاڑی سے جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔ مکتی باہنی والے گاڑی راستے میں روک لیتے ہیں اور ڈبوں میں سے بہاریوں' پنجابیوں' پٹھانوں کو باہر نکال کر قتل کردیتے ہیں۔ ہم دریا میں سفر کرکے وہاں جائیں گے۔ چاند پور دریا کے کنارے پر ہی ہے۔۔۔۔"

یہ بنگالی بوڑھا مجھے اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑا۔ وہ مجھے غیر آباد علاقے سے لے کر جارہا تھا۔ ہم پہلے ویران علاقے سے گذرے۔ پھر پٹ سن کے کھیت آگئے۔ ایک دو ندیوں کے پل عبور کئے۔ آخر ہم ایک گھاٹ پر پہنچ گئے جہاں سے بڑی بڑی کشتیاں مسافروں کو لے کر چاند پور کی طرف جاتی تھیں۔ میرے پاس جرمن بوڑھے کے دیئے ہوئے روپے موجود تھے۔ میں نے دو روپے کشتی کے ملاح کو دیئے۔ کچھ دیہاتی بنگالی بھی بانسوں کے اور دھان کے گٹھے اور اپنا سامان لئے کشتی میں سوار تھے۔ کشتی بادبانی تھی اور دو ملاح ڈانڈ چلارہے تھے۔ کشتی دریا میں کنارے کنارے ہو کر روانہ ہوگئی۔ دریا میں یہ کافی لمبا سفر تھا۔ کشتی میں ہی ہم نے ابلے ہوئے تھوڑے سے چاول کھائے جو کشتی کے ملاح نے دیگچے میں سے نکال کر ہمیں دیئے تھے۔ شام ہو رہی تھی جب ہم چاند پور پہنچ گئے۔

چاند پور شہر کی بتیاں روشن ہوچکی تھیں۔ یہ بالکل ہمارے وزیر آباد کی طرح کا چھوٹا سا شہر تھا۔ میرا ساتھی بنگالی بوڑھا شہر کے اوپر اوپر سے ہو کر جارہا تھا۔ ہم ایک بازار میں داخل ہوگئے۔ یہاں بنگلہ دیش کے پرچم دکانوں کے باہر لگے ہوئے تھے۔ مگر کوئی نعرے بازی نہیں ہورہی تھی۔ کوئی جلوس بھی نہیں تھا۔ بھارتی سپاہی کہیں کہیں نظر آئے۔ ایک گلی میں داخل ہوئے تو چند قدم چلنے کے بعد چھوٹی سی مسجد آگئی جس میں شام کی اذان ہورہی تھی۔ مسجد میں کچھ نمازی بیٹھے تھے۔ کچھ وضو کررہے تھے۔ ہم نے بھی وضو کیا اور نمازیوں کے پیچھے خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ایک پتلی سی لمبی سفید ڈاڑھی والے دبلے پتلے امام مسجد نے کھڑے ہو کر تکبیر پڑھی۔ سب نمازی ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ نماز شروع ہوگئی۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ میں پاکستان میں ہوں اور یہ سارے میرے مسلمان بھائی ہیں۔ ہم صرف مسلمان ہیں۔ اسلام کے رشتے نے ہمیں ایک دوسرے سے پیوستہ کر رکھا ہے۔

نماز کے بعد بوڑھے بنگالی نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور جب سب نمازی اٹھ کر چلے گئے تو وہ امام صاحب کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ ایک دو منٹ تک دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ شروع میں امام صاحب اس طرح سرہلاتے رہے جیسے وہ کسی افسوس ناک خبر پر رنج و غم کا اظہار کر رہے ہوں۔ ظاہر ہے بوڑھے بنگالی نے اسے بتایا ہو گا کہ مکتی باہنی کے ہندوؤں نے اس کے بھائی اور بھاوج کو ہلاک کردیا ہے اور ان کی بہو کو اٹھاکر لے گئے ہیں۔ اس کے بعد جب اس نے میری بات شروع کی تو امام صاحب نے نظریں اٹھاکر میری طرف دیکھا۔ بوڑھے بنگالی نے مجھے اشارے سے بلالیا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر امام صاحب کو سلام کرکے ان کے پاس ہی ادب سے بیٹھ گیا۔ امام صاحب بنگلہ زبان میں بوڑھے بنگالی سے کچھ دیر میری بابت باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے میری طرف متوجہ ہو کر نسبتاً صاف اردو میں کہا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں تمہیں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا' زندگی موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر تمہیں ایک ایسی جگہ ضرور پہنچا دوں گا جہاں تم حالات کے ٹھیک ہو جانے تک محفوظ رہو گے۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"مولانا میں آپ لوگوں کا احسان کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

امام صاحب کہنے لگے:۔

"اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم مسلمان ہو' پاکستانی ہو' ہم بھی مسلمان اور پاکستانی ہیں۔ ہمارے لوگ بھارت کے مکروہ' زہریلے پراپیگنڈے اور مجیب الرحمان کے بہکاوے میں آگئے ہیں۔ آخر فتح اسلام کی ہوگی۔ بنگلہ دیش ایک بار پھر پاکستان بنے گا' انشاء اللہ۔ میرے ساتھ اندر آجاؤ۔"

مولوی صاحب کا مکان مسجد کے ساتھ ہی تھا اور مسجد کا پچھلا دروازہ ان کے گھر کے سامنے کھلتا تھا۔ چھوٹا سا ایک منزلہ پرانا مکان تھا۔ ان کے بال بچے "کھلنا" گئے ہوئے تھے۔ وہ وہاں اکیلے رہ رہے تھے۔ رات کا کھانا انہوں نے خود بنایا۔ کھانا کھا کر ہم صف پر بیٹھ گئے۔ دونوں بوڑھے آپس میں بنگلہ زبان میں باتیں کرنے لگے۔ میرے لئے کونے میں چارپائی پر بستر لگا دیا گیا۔ امام صاحب نے کہا:

"بیٹا! تم یہاں آرام کرو۔ فکر بالکل نہ کرنا۔ جب تک میں یہاں ہوں' تمہاری طرف مکتی باہنی والے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ مگر تمہیں رات کے چار بجے میں جگا دوں گا۔ تم میرے بھائی کے ساتھ اس جگہ چلے جاؤ گے جس کا بندوبست ہم دونوں ابھی کرنے جا رہے ہیں۔"

امام صاحب نے میرے بھائی کے الفاظ کہتے ہوئے میرے محسن بوڑھے بنگالی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد امام صاحب اور بوڑھا بنگالی مجھے کمرے میں

چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے نیند کہاں آتی تھی۔ جاگتا رہا۔ کوئی دو ڈیڑھ گھنٹے بعد دونوں واپس آگئے۔ مجھے جاگتا دیکھ کر امام صاحب نے حیرت سے کہا:

"تم سوئے نہیں بیٹا؟"

میں نے کہا:۔ "پریشانی کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔"

بوڑھا بنگالی کہنے لگا:۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ امام صاحب نے تمہارے لئے ایسی جگہ کا بندوبست کر دیا ہے کہ جہاں اگر تم ایک سال بھی رہنا چاہو تو بڑے اطمینان کے ساتھ رہ سکتے ہو۔"

امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:۔ "تم ایسی جگہ جا رہے ہو جہاں بہت سے لوگ ہوں گے مگر وہ نہ تمہیں دیکھ سکیں گے' نہ تمہاری آواز سن سکیں گے۔ نہ تم ان سے کوئی بات کر سکو گے اور نہ وہ تم سے کوئی بات کر سکیں گے۔"

میں دل میں بڑا حیران ہوا کہ ایسی کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔ مگر وہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ بنگالی بوڑھے نے امام صاحب سے کہا:

"مولانا! میرا تو خیال ہے کہ میں ابھی اسے وہاں پہنچا آتا ہوں۔ اسے نیند بھی نہیں آرہی۔ رات کا وقت بھی ہے' باہر سائیکل بھی پڑا ہے۔"

امام صاحب نے مجھ سے پوچھا:۔ "بیٹا! تم ابھی سونا چاہتے ہو یا ابھی اپنی پناہ گاہ میں جانا چاہتے ہو...؟"

میں نے کہا:۔ "مجھے ابھی وہاں پہنچا دیجئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے بالکل نیند نہیں آرہی۔"

امام صاحب نے بوڑھے بنگالی سے کہا:۔ "تو برخوردار کو لے جاؤ۔ اللہ مالک ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مکان کے باہر چھوٹی سی گلی میں ایک سائیکل پڑا تھا۔ بوڑھا بنگالی میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ مجھے آگے بٹھانے لگا تو میں نے کہا:" یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ آگے بیٹھیں گے، میں سائیکل چلاؤں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

بوڑھا بنگالی سائیکل پر آگے بیٹھ گیا۔ میں نے سائیکل چلانی شروع کردی۔ وہ مجھے بتاتا جاتا تھا کہ کس طرف کو جانا ہے۔ گلی سے نکلے تو ایک بازار آگیا۔ رات کے وقت ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس بار بھی وہ مجھے غیر آباد علاقے کی طرف سے ہوکر لے جارہا تھا۔ شہر کے باہر کھیت آگئے۔ کھیتوں کے ساتھ ساتھ پگڈنڈی جاتی تھی۔ میں اس پر سائیکل چلارہا تھا۔ پگڈنڈی نے ہمیں ایک کھلی جگہ پہنچادیا۔ اندھیرے میں کچھ درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بوڑھے بنگالی نے کہا: "یہاں سائیکل روک دو۔"

میں سائیکل سے اتر پڑا۔ وہ بھی نیچے اتر آیا۔ سائیکل ہم نے ایک جگہ درختوں میں کھڑی کردی۔ آگے اندھیرے میں اونچی جگہ تھی۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک کافی کھلا میدان سا آگیا۔ یہاں مجھے اندھیرے میں جگہ جگہ ڈھیریاں نظر آئیں۔ میں نے بوڑھے بنگالی سے آہستہ سے پوچھا:

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

وہ بولا: "بیٹا! یہ قبرستان ہے۔ امام صاحب نے جب تمہیں کہا تھا کہ تم ایسی جگہ جارہے ہو جہاں نہ تمہیں کوئی دیکھے گا' نہ تم سے بات کرے گا تو ان کا مطلب تھا کہ ہم تمہیں ایک قبرستان میں لے جارہے ہیں۔"

مجھ پر ایک ہلکا سا خوف طاری ہوگیا۔ خوف اس بات کا تھا کہ کہیں کسی طرف سے قبر سے کوئی روح نکل کر مجھے نہ پکڑ لے۔ میں نے سنا ہوا تھا کہ قبرستان میں رات کے وقت روحیں آتی ہیں اور اپنی اپنی قبروں کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس وقت اگر

کوئی ان کے قریب سے گذرے تو اسے پکڑ لیتی ہیں۔ جب میں نے اس کا ذکر بوڑھے بنگالی سے کیا تو وہ کہنے لگا:

"بیٹا! یہ ساری غلط باتیں ہندوانہ توہمات نے پھیلا رکھی ہیں۔ مسلمان کو ایسی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ روح تو اللہ کی امانت ہے۔ مرنے کے بعد یہ امانت اللہ میاں کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔ قبر میں تو انسان کا فانی جسم ہی رہ جاتا ہے۔ مسلمان کا صرف اتنا فرض ہے کہ اگر وہ کسی قبر کے قریب سے گذرے تو فاتحہ پڑھ کر مرنے والے کی روح کی مغفرت کی دعا مانگے۔ چلو سب سے پہلے ہم فاتحہ پڑھتے ہیں۔"

ہم اندھیرے میں قبروں کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ہاتھ اٹھاکر دعائے فاتحہ پڑھی۔ مجھے تو فاتحہ پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ یا اللہ جو فاتحہ یہ بزرگ بنگالی پڑھ رہے ہیں' اسے میری طرف سے بھی قبول فرما۔

اس قبرستان کے جنوب کی جانب لکڑی کا ایک جھونپڑا بنا ہوا تھا جس کے باہر ایک دیا جل رہا تھا۔ بوڑھے بنگالی نے قبروں کے درمیان اس طرف چلتے ہوئے کہا:

اس جھونپڑے میں دینو بابا رہتا ہے جو قبرستان کا گورکن ہے۔ وہ جاگ رہا ہوگا۔ ہم ابھی اس کے پاس سے ہوکر گئے ہیں۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہوگے۔ میت اور میت لانے والوں کے سوا یہاں اور کوئی نہیں آتا۔ میت بھی دوسرے تیسرے روز ہی آتی ہے۔ میت کے ساتھ پانچ چھ آدمی ہی ہوتے ہیں جو میت دفن کرکے چلے جاتے ہیں۔"

جس جھونپڑے کے باہر دیا جل رہا تھا' اس کے اندر دینو بابا گورکن ابھی جاگ رہا تھا۔ بوڑھے بنگالی نے اسے مجھ سے ملایا اور بنگلہ زبان میں باتیں کرنے لگا۔ دینو بابا دبلا پتلا پکے رنگ کا بوڑھا تھا جیسے کہ عام طور پر وہاں کے بوڑھے ہوتے ہیں۔ دینو بابا صوبہ بہار میں رہ چکا تھا اور بڑی صاف اردو بول لیتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بیٹا! فکر نہ کرو۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ مکتی باہنی والوں کو قبرستان میں آنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ اس لئے کہ یہاں انہیں کچھ ملنے کی امید نہیں ہے۔ تم چاہے ایک برس یہاں رہو۔"

بوڑھا بنگالی بولا۔

"بیٹا! اب تم بڑی محفوظ جگہ پر آگئے ہو۔ جیسے ہی شہروں کے حالات ذرا اچھے ہوئے' میں خود تمہیں اس جگہ پہنچادوں گا جہاں تم جانا چاہو گے۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک پاکستان جانے کے راستے بھی کھل جائیں۔ اب میں جاتا ہوں میں روزانہ تم سے ملنے نہیں آسکتا۔ لیکن ہفتے میں ایک بار چکر ضرور لگاتا رہوں گا۔"

میرا محسن بنگالی مجھے بوڑھے گورکن کے حوالے کرکے چلا گیا گورکن کہنے لگا۔ "پیچھے میرا ایک اور جھونپڑا ہے۔ میں نے وہاں تمہارے رہنے کا تھوڑا بہت انتظام کر دیا ہے۔ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

دوسرا جھونپڑا وہاں سے کوئی پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر درختوں کے نیچے تھا۔ یہ چھوٹا تھا۔ اس کے اندر اندھیرا تھا۔ گورکن نے اندر جاکر دیا روشن کیا تو میں نے دیکھا کہ کونے میں پھاوڑے' کدالیں' پلاسٹک کی بالٹی اور کچی اینٹیں کونے میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان بانس کی چارپائی پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ بھی رکھا ہوا تھا۔ گورکن نے کہا۔

"تم یہاں سویا کرو گے۔ دن کے وقت بے شک نکل آیا کرنا۔ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن قبرستان کے احاطے میں ہی رہنا۔ باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ میں دن میں تھوڑی دیر کے لئے شہر اپنی بیٹی کے گھر چلا جاتا ہوں۔ کھانا وغیرہ میں خود ہی پکا لیتا ہوں۔ اب تم سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

موسم خوشگوار تھا۔ جھونپڑی میں جو ہلکی ہلکی گرمائش تھی' وہ جسم کو سکون پہنچا رہی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا اور پتلی چادر اوپر کر لی۔ کیونکہ وہاں مچھر بہت تھے۔ گورکن نے جاتے ہوئے کہا۔

"دیا اگر چاہو تو بجھا دینا۔ دروازہ میں کھلا رکھے جا رہا ہوں۔ یہاں کوئی گیدڑ وغیرہ نہیں آتے۔ بے فکر رہو۔"

گورکن چلا گیا۔ میں چارپائی پر چادر اوپر کئے لیٹا آنکھیں کھولے جھونپڑے کی چھت کو دیکھ رہا تھا جس میں گھاس پھونس باہر نکلا ہوا تھا۔ قبرستان میں واقعی موت کی خاموشی طاری تھی۔ کسی جانب سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی جھینگر کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ مجھے لاہور یاد آنے لگا۔ دل میں خیال آیا۔ کیا میں کبھی لاہور واپس پہنچ سکوں گا؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رات کو ایسا سویا کہ صبح آنکھ کھلی تو جھونپڑی میں دن کی سفید روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دیا اسی طرح جل رہا تھا۔ اس کی لو بڑی مدھم پڑ گئی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر دیا بجھا دیا۔ میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ قبروں کی جانب مجھے بوڑھا گورکن نظر آیا۔ وہ کسی قبر کی مٹی ٹھیک کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر سلام کیا۔ وہ بولا:

"کہو بیٹا! رات کیسے گذری؟"

میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے جی۔ بڑی گہری نیند سویا ہوں۔"

"چلو آؤ اب ناشتہ کر لو۔ وہاں اس طرف پہلے جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ ذرا نیچے اترو گے تو ایک ندی بہتی ہوئی ملے گی۔"

یہ قبرستان زمین سے اونچی جگہ پر بنایا گیا تھا کہ اگر دریا میں سیلاب آجائے تو قبریں محفوظ رہیں۔ میں دوسری طرف سے نشیب میں اترا تو نیچے درختوں کے درمیان چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ ندی کا میٹھا ٹھنڈا پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا اور اوپر آگیا۔ گورکن اپنے جھونپڑے میں تھا۔ اس نے مجھے ابلے ہوئے چاول اور مچھلی کھانے کو دی۔ پھر اس نے چائے بنائی اور گلاس میں ڈال کر مجھے دی۔

ایک گلاس خود لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے ملک کے حالات کے بارے میں باتیں کرنے لگا:۔

"شیخ مجیب بھارت کا جاسوس ہے۔ اس نے ہم بنگالی مسلمانوں کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ ہم پر بھارت کی فوج کو سوار کر دیا ہے۔ تم دیکھ لینا۔ اسکا انجام بہت برا ہو گا۔ ہم تو بھارت کے غلام ہو گئے ہیں۔ پہلے ہم آزاد تھے۔ بنگالیوں کے ساتھ دھوکا ہوا ہے....."

میں نے اس قبرستان میں رہنا تو شروع کر دیا تھا مگر دل کو ایک مسلسل بے چینی لگی ہوئی تھی۔ میں وہاں مطمئن نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے' وہاں سے نکل کر کسی نہ کسی طرح نیپال یا برما پہنچ جاؤں اور وہاں سے اپنے وطن پاکستان چلا جاؤں۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی کہ مجھے قبرستان میں کچھ وقت ہر حال میں گذارنا تھا۔ کیونکہ سارے مشرقی پاکستان میں حالات سے مخدوش تھے۔ میں قبرستان سے نکل کر کسی بھی جگہ قتل ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی دن ایک جنازہ آگیا۔ میت کو لوگوں نے چارپائی پر اٹھایا ہوا تھا۔ میت کے اوپر کلمہ شریف والی سبز چادر پڑی تھی۔ قبر پہلے سے تیار تھی۔ گورکن دینو بابا اپنے ایک آدمی کے ساتھ جو دن کے وقت وہاں میت کو دیکھ کر آجاتا تھا اور دفن کرنے کے بعد چلا جاتا تھا' قبر کو تیار کر رہے تھے۔ میت کو دفن کرنے کے بعد لوگ فاتحہ پڑھ کر چلے گئے۔ دو تین آدمی وہاں قبر پر ہی کھڑے رہے' یہ مرنے والے کے قریبی عزیز اور رشتے دار ہوں گے۔ میں اپنی جھونپڑی کے قریب ایک درخت کے پیچھے بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب دینو گورکن نے قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد اوپر پھول وغیرہ بکھیر دیئے تو وہ لوگ بھی واپس چلے گئے۔ ان میں سے ایک آدمی تھوڑی دور جا کر واپس آگیا اور گورکن دینو سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ بھی چلا گیا۔ میں نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ میں نے کوئی خاص خیال نہ کیا۔ لیکن میں نے اچھا کیا کہ اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہا۔ اٹھ کر گورکن دینو کے پاس نہیں گیا۔ وہ آدمی دینو گورکن سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ گورکن نے اس کے جانے کے بعد میری جھونپڑی کی طرف دیکھا اور قبر پر مٹی کو ٹھیک کرنے کے بعد اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔ میں بھی اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں آ گیا۔ اتنے میں گورکن کہیں سے اچانک نمودار ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ کہنے لگا:

"تم لوگوں کو رات کو یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟"

میں نے جلدی سے کہا:

"بابا! مجھے تو معلوم نہیں۔ ہم رات کے اندھیرے میں یہاں آئے تھے۔"

گورکن بولا: "ابھی ابھی ایک میت کے ساتھ جو لوگ آئے تھے' ان میں عوامی لیگ کا بھی ایک آدمی تھا۔ کہہ رہا تھا کہ پاکستانی فوج کا ایک پنجابی سپاہی نذیر گھاٹ سے بھاگ کر چاند پور میں آ گیا ہوا ہے۔ اس کی خبر رکھنا۔ اگر وہ قبرستان میں آئے تو ہمیں اطلاع کر دینا۔ مکتی باہنی کا کمانڈر اسکی تلاش میں چاند پور پہنچ گیا ہے۔"

میں نے کہا: "پھر تو مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ کسی نے مخبری کر دی تو میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

دینو گورکن چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا: "ابھی جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر گئے بھی تو شہر میں پکڑے جاؤ گے۔ یہ آدمی عوامی لیگ کا خاص آدمی تھا۔ اس نے کہا ہے تو چاند پور میں مکتی باہنی والے ضرور تمہیں کھوج لگا رہے ہوں گے۔"

میں پریشان ہو گیا تھا۔ مکتی باہنی والوں سے جان بچا کر میں نے جس طرح پھرتی سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی تو انہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں پاکستانی فوج کا سپاہی ہوں۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مکتی باہنی والے بھارتی گوریلوں نے قیمتیں مقرر کر رکھی تھیں۔ اگر کوئی پنجابی پکڑ کر لاتا تو اسے دو سو روپے معاوضہ دیا جاتا۔ بہاری

کو پکڑ کر لاتا تو ڈیڑھ سو روپے دیئے جاتے۔ اسی طرح پٹھان کو پکڑ کر لانے کا الگ معاوضہ تھا۔ سب سے زیادہ معاوضہ کسی مفرور پاکستانی فوجی کر پکڑ کر لانے یا اس کی نشان دہی کرنے کا مقرر تھا۔ ممکن تھا کہ عوامی لیگ کا یہ آدمی جس نے گورکن سے بات کی تھی' معاوضے کے لالچ میں میری تلاش میں ہو۔

اگرچہ میرا دل اس واقعے کے بعد وہاں سے اکھڑ گیا تھا اور میں نے وہاں سے چلے جانے کا سوچ لیا تھا لیکن گورکن کے کہنے اور تسلی دلانے پر میں نے اپنا فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ میری ایک اور حماقت تھی۔ مجھے اسی وقت وہاں سے کسی طرف نکل جانا چاہئے تھا۔ لیکن تقدیر میں جو لکھا تھا' وہ تو ہو کر ہی رہنا تھا۔ میں جھونپڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ شام ہو گئی۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح سے نہیں چھایا تھا۔ گورکن دینو بھی ایک سیدھا سادا بنگالی مسلمان تھا۔ اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ اگر کسی نے اس سے میرے بارے میں پوچھا ہے تو یقینی طور پر ان لوگوں نے قبرستان کی نگرانی کے واسطے وہاں اپنا خفیہ آدمی ضرور رکھ دیا ہو گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ قبرستان پر شام کے سائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے کہ گورکن دینو کا وہ آدمی جو اس کے ساتھ کام کرتا تھا اور صرف میت کے وقت وہاں آ جاتا تھا' قبرستان کی پچھلی طرف سے دوڑتا ہوا آیا۔ اس وقت گورکن دینو مجھے چائے کا گلاس دے کر میری جھونپڑی کا دروازہ بند کر کے باہر نکلا ہی تھا۔ اس بنگالی نے جلدی جلدی گورکن بابا کو بنگلہ میں کچھ کہا اور جدھر سے آیا تھا' اسی طرف بھاگ گیا۔ گورکن وہیں سے میرے جھونپڑے میں واپس آیا اور بولا:

"جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔"

چائے کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا۔ ابھی میں نے اس میں سے صرف ایک ہی گھونٹ پیا تھا اور دروازے کی درز میں سے گورکن کو اپنے آدمی سے باتیں کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سن رہا تھا۔ چونکہ وہ بنگلہ میں بات کر رہے تھے' اس لئے مجھے ان کی کوئی بات سمجھ میں نہیں ائی تھی۔ اتنا ضرور اندازہ ہوگیا کہ کوئی خطرناک بات ہوگئی ہے۔ جب گورکن گھبرایا ہوا جھونپڑی میں آیا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا تو میں سمجھ گیا کہ میری مخبری ہوگئی ہے اور اب میری خیر نہیں۔ میں نے چائے کا گلاس وہیں زمین پر رکھ دیا اور گورکن کے پیچھے پیچھے جھونپڑی سے نکل کر تیز تیز چل پڑا۔ گورکن بڑی تیزی سے درختوں جھاڑیوں میں سے گذرتا اس طرف جارہا تھا جس طرف نشیب میں نیچے ندی بہتی تھی۔ وہ نشیب میں اتر گیا۔ یہاں شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ندی کا پانی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ گورکن کہنے لگا:۔

"یہاں جھاڑیوں میں چھپ جاؤ۔ کسی نے تمہاری مخبری کردی ہے۔ مکتی باہنی تمہیں پکڑنے یہاں آرہی ہے۔ خبردار یہاں سے بالکل نہ ہلنا۔ جلدی کرو۔"

یہ کہہ کر گورکن واپس چلا گیا۔

میں جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا یہاں بیٹھنا میرے لئے خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ اگر مکتی باہنی والے اس طرف آگئے تو میں ان کی نظروں سے نہیں بچ سکوں گا۔ وہ تو سنگینیں مار مار کر ایک ایک جھاڑی میں مجھے تلاش کریں گے۔ کیا کروں؟ کیا بھاگ جاؤں؟ مگر کس طرف بھاگوں؟ مجھے تو اس علاقے کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی کہ ندی آگے کس طرف جاتی ہے۔ پیچھے کس جانب جانکلتی ہے۔ اتنے میں قبرستان میں آدمیوں کی اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد ایکدم سے برین گن کے برسٹ کا دھماکہ گونج اٹھا۔ میں نے گھبرا کر ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ قبرستان میں برین گن کے برسٹ فائر ہونے لگے۔ پھر آدمیوں کی آوازیں مجھے ندی کے نشیب کی جانب سے آتی سنائی دینے لگیں۔

مکتی باہنی میرے پیچھے میری تلاش میں ندی پر اسی جگہ پہنچ گئی تھی' جہاں سے اٹھ کر میں نے دوڑنا شروع کیا تھا۔ ندی چھوٹی سی تھی۔ میں اس میں کود گیا اور دوسرے کنارے پر آگیا۔ یہاں دوسری جانب ڈھلان تھی جہاں جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں ان میں اتر گیا۔ جھاڑیوں نے میرے منہ کو چھیل دیا۔ گھاس سخت تھی۔ مگر اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ پیچھے فائرنگ شروع ہوگئی تھی اور گولیاں ان درختوں کی شاخوں کو توڑتی ہوئی گذر رہی تھیں جو ندی کے کنارے پر کھڑے تھے اور جہاں سے میں نیچے جھاڑیوں میں اترا تھا۔ میں دیوانہ وار جھاڑیوں میں الجھتا دوڑتا چلا جارہا تھا۔ شام کا اندھیرا ہوجانے کی وجہ سے ہلتی ہوئی جھاڑیوں پر کسی کی نظر نہیں پڑسکتی تھی۔ اسی وجہ سے میرا بچاؤ ہوگیا تھا۔ میں اب اونچی گھاس میں دوڑ رہا تھا۔ گھاس میں دوڑنا آسان نہیں تھا۔ گھاس سخت تھی۔ چند قدم دوڑنے کے بعد میں جھک کر تیز تیز چلنے لگا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا میں کس طرف جارہا ہوں۔ جان بچاکر بھاگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ فائرنگ کی آواز مجھ سے دور ہوتی گئی جس سے میں نے اندازہ لگالیا کہ میں دشمنوں کی پہنچ سے باہر ہوگیا ہوں۔ لیکن میں ابھی تک پوری طرح محفوظ نہیں تھا۔ اونچی گھاس اور جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میرے سامنے ایک کھلی جگہ تھی جہاں ایک بھی درخت نہیں تھا۔ رات کا اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ کھلی جگہ کے آگے ناریل کے درختوں کی قطار نظر آرہی تھی۔ میں اس طرف دوڑ پڑا۔ درختوں کے نیچے جاکر دیکھا کہ آگے زمین ڈھلانی ہوگئی تھی۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ڈھلان اتر گیا۔

ایک تالاب دیکھا جس کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ تالاب کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ میں تیز تیز چلتا کوٹھڑی کے قریب پہنچ کر سانس لینے کے لئے رک گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں وہیں اونچی کوٹھڑی کی دیوار کے پاس بیٹھ گیا اور سانس درست کرنے لگا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ درختوں پر پرندے شور مچانے لگے تھے۔ تالاب میں سے جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب ذرا سانس درست ہوا تو اٹھا اور پھر چل پڑا۔ دو قدم گیا ہوں گا کہ سامنے درختوں میں سے ایک عورت کو آتے دیکھا جس کے بال کھلے تھے۔ اس نے جوگنوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی چھوٹی سی بالٹی تھی۔

وہ عورت درختوں سے نکل کر بالکل میرے سامنے آگئی تھی۔ اتنے میں میرے پیچھے سے اور دائیں جانب سے بھی آدمیوں کی آوازیں ایکدم سے آنے لگیں۔ پھر دو تین ہوائی برسٹ فائر ہوئے۔ میں سمجھ گیا کہ مکتی باہنی میری تلاش میں وہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ لوگ اوپر سے ہو کر مجھے گھیرے میں لیتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ میں نے گھبرا کر اس عورت سے کہا: "مجھے بچالو۔ وہ مجھے قتل کرنے آئے ہیں۔
"

جوگن عورت نے بھی فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ مجھے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہیں درختوں میں بائیں جانب گھوم گئی۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے تیز تیز چل رہا تھا۔ آدمیوں کی آوازیں اور فائرنگ کے دھماکے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

ایک جگہ درختوں کے پاس ہی گھاس پھونس کا ڈھیر پڑا تھا۔ جوگن اس کے پیچھے چلی گئی۔ میں بھی پیچھے چلا گیا۔ ڈھیر کے پیچھے ٹیلے کی دیوار تھی۔ دیوار میں ایک جگہ گھنی جھاڑی تھی۔ جوگن نے جھاڑی کی شاخوں کو بالٹی زمین پر رکھ کر ایک طرف ہٹایا تو وہاں ایک سرنگ کا دہانہ نظر آیا۔ جوگن نے کچھ اردو کچھ بنگلہ میں کہا:

"اندر جا کر چھپ جاؤ۔ چلو، چلو۔۔۔"

میں سرنگ میں گھس گیا۔ اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مگر میرے پاؤں صاف زمین پر پڑے۔ جیسے کسی نے جگہ صاف کر رکھی ہو۔ میں وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ جوگن نے کہا:

"باہر نہ آنا۔۔۔"

اس نے ہاتھ پیچھے ہٹائے تو جھاڑیوں کی شاخیں آپس میں مل گئیں اور سرنگ کا دروازہ ان کے پیچھے ڈھک گیا۔ میں دیر تک سرنگ کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ مجھے اپنا جسم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دوران تالاب کی جانب سے مجھے آدمیوں کی آوازیں اور نعرے کچھ دیر تک سنائی دیتے رہے۔ ایک دو ہوائی فائر بھی ہوئے۔ کچھ دیر تک سنائی دیتے رہے۔ ایک دو ہوائی فائر بھی ہوئے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے دس پندرہ منٹ کے بعد جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اندھیرا اب کافی گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے جوگن کا سایہ سا نظر آیا۔ اس نے کہا:

"کیا تم بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں۔۔۔"

وہ بولی: "بیٹھے رہو۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

جھاڑیاں ساکن ہو گئیں۔ جوگن چلی گئی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ سر لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور اللہ کے حضور اپنی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی آئے۔ پھر اپنے آپ خشک بھی ہو گئے۔ جہاں کوئی آنسو دیکھنے والا نہ ہو' وہاں آنسو جلدی خشک ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر گذری ہو گی کہ جوگن دوبارہ آگئی۔ اندھیرے میں اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ میرے قریب سے سرنگ میں داخل ہوئی۔ مجھے اس کے جسم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے یا اس کے لباس سے ناریل کے تیل کی خوشبو آئی۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس کا جسم میرے جسم سے لگا ہوا تھا۔ مجھے ماچس جلانے کی آواز آئی۔ پھر سرنگ میں روشنی ہوگئی۔ جوگن نے دیا روشن کر دیا جو سرنگ کی دیوار کے سوراخ میں رکھا ہوا تھا۔ سرنگ میں بمشکل دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اسکی چھت کافی اونچی تھی مگر دیواریں قریب قریب تھیں۔ جوگن نے میری طرف دیکھا۔ میں بھی اس عورت کو دیکھ رہا تھا جس نے عین وقت پر میری جان بچائی تھی۔

اس عورت کا رنگ گہرا سانولا بلکہ گہرا براؤن تھا۔ آنکھیں بڑی چمک رہی تھیں۔ اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس کو وہ سینے پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوپر کر لیتی تھی۔ اس کے نقش و نگار ایسے تھے کہ وہ آسامی عورت لگتی تھی۔ ناک کے نتھنے چوڑے تھے' ہونٹ موٹے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی:۔

"کیا تم پنجابی ہو؟"

میں نے کہا:۔ "ہاں۔۔۔"

پھر میں نے اسے اپنے فرار کے تھوڑے سے واقعات جلدی سنا ڈالے۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اتنے غور سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ گہرا سانس لے کر بولی:

"میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم پنجابی ہو۔ جب تم نے بات کی تو پھر تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم پنجابی ہو۔"

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرے پنجابی ہونے پر اتنا زور کیوں دے رہی تھی۔ میں نے کہا:

"تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے یہاں سے کوئی ایسا راستہ بتا دو جہاں مکتی باہنی والے نہ ہوں۔ میں چٹا گانگ کے جنگلوں میں جانا چاہتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ دیئے کی ہلکی روشنی میں اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔ کہنے لگی:

"یہاں سے جاؤ گے تو مکتی باہنی تمہیں پکڑ لے گی۔ ہر طرف ان کے آدمی پھر رہے ہیں۔ تم تو شکل سے پہچانے جاتے ہو کہ تم پنجابی ہو۔ وہ لوگ مجھے ملے تھے۔ ان میں مکتی باہنی کا کمانڈر بھی تھا۔ اسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یہاں پاکستانی فوج کا ایک پنجابی سپاہی بھاگ کر آیا ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ یہاں کوئی پنجابی سپاہی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دوسری طرف نکل گیا ہو۔ انہوں نے میری بات پر یقین کر لیا تھا۔ مگر جاتے جاتے مکتی باہنی کمانڈر نے کہا تھا کہ ہم نے اس سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہوا ہے۔ اگر پنجابی سپاہی اس طرف آئے تو تم ہمیں خبر کر دینا۔ میں نے کہا تھا ٹھیک ہے' میں خبر کر دوں گی۔ پھر وہ چلے گئے۔"

میں نے کہا:۔ "تم نے میری جان بچائی دیوی جی۔ میں تمہارا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

جوگن نے کہا۔ "میرا نام کملاشی ہے۔ دیوی نہیں ہے۔"

اور وہ مسکرا دی۔ پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی:

"تم ابھی اسی جگہ چھپ کر بیٹھے رہو' ابھی باہر چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا ہے۔ مکتی باہنی والوں نے یہاں بہت پنجابیوں' بہاریوں' پٹھانوں کا خون کیا ہے۔ باہر مت نکلنا۔ جب رات گہری ہو جائے گی تو میں آکر تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں سرنگ میں بیٹھا اس جوگن کے متعلق سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کی عورت ہے۔ کبھی لگتا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ وہ جان بوجھ کر مجھے وہاں رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اسے مجھ سے کیا لالچ ہو سکتا ہے۔ نہیں'

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں.... یہ جوگن ٹائپ عورت ہے' اس کے دل میں میرے لئے ہمدردی کے جذبات ہیں اور وہ جو کچھ کر رہی ہے' میری جان بچانے کے لئے کر رہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں باہر میری جان کو سخت خطرہ تھا۔ مکتی باہنی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس عورت کے بارے میں مجھے اس بات کا ضرور یقین تھا کہ وہ مجھے مکتی باہنی والوں کے حوالے نہیں کرے گی۔ سرنگ میں دیا جل رہا تھا۔ اسکی روشنی بڑی ہلکی تھی۔ سرنگ کا دروازہ جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر اندر تازہ ہوا شاخوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ باہر آہستہ آہستہ خاموشی چھانے لگی۔ درختوں پر بولنے والے پرندے بھی خاموش ہوگئے۔ اب صرف کسی کسی وقت کسی جھینگر کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ اٹھ کر سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر گذر گئی۔ باہر رات گہری ہوگئی تھی۔ پھر مجھے باہر ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی جھاڑیوں میں سے گذر کر چلا آ رہا ہو۔ میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ جھاڑیاں ایک طرف ہٹ گئیں اور جوگن نمودار ہوئی۔ کہنے لگی:

"آ جاؤ۔"

میں سرنگ سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے اس کوٹھڑی میں لے آئی جو تالاب کے کنارے پر بنی ہوئی تھی۔ یہ مندر بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کوٹھڑی میں کسی دیوی دیوتا کا بت نہیں تھا۔ فرش پر ناریل کی سوکھی چھال بچھی ہوئی تھی۔ یہاں بھی دیوار کے طاق میں تیل کا دیا جل رہا تھا۔ پانی کا مٹکا اور مٹی کا پیالہ بھی تھا۔ ایک طرف ٹین کا صندوق پڑا تھا۔ جوگن نے صندوق کھول کر اس میں سے ایک سرہانہ اور گیروے رنگ کی دو چادریں نکالیں۔ سرہانہ اور چادر میری طرف پھینک کر کہا۔

"تم یہ لے کر یہاں سو جاؤ۔"

ایک چادر اس نے اپنے پاس رکھ لی۔ صندوق بند کرنے کے بعد وہ سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی۔ چادر اس نے ٹانگوں پر ڈال لی تھی۔ میں نے کہا:

"کملاشی جی! مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی' آپ یہ سرہانہ مجھ سے لے لیں اور سو جائیں۔"

وہ مسکرائی:۔" ہم تو جوگی لوگ ہیں۔ ہم ساری ساری رات جاگ کر بھگوان کی بھگتی کرتے ہیں' تم سو جاؤ۔ میں جاگتی رہوں گی۔"

مجھے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دل میں وسوسے بھی پیدا ہو رہے تھے کہ خدا جانے میں سو جاؤں تو وہاں مکتی باہنی والے آ جائیں اور مجھے پکڑ کر لے جائیں۔ اس عورت کے پاس تو چاقو تک نہیں ہے۔ یہ مجھے ان سے نہ بچا سکے گی۔ میرے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کاش اس وقت اور کچھ نہیں تو میرے پاس ایک پستول ہی ہوتا۔ فیاض اور شاہد بٹ کے پاس ڈھاکے میں ایک لائسنس یافتہ پستول تھا جو انہوں نے اپنے شوروم میں رکھا ہوا تھا۔ کاش آتے وقت وہ پستول ہی ساتھ لے آتا۔ مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اب ایسی باتیں سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں لیٹ گیا اور چادر اوپر کر لی۔ کسی وقت غنودگی سی طاری ہو جاتی۔ پھر جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھنے لگتا۔ جوگن اسی طرح دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نہ جانے رات کے کس لمحے مجھے نیند آ گئی۔

میں تین دن اسی جوگن کے پاس سرنگ میں چھپا رہا۔ اس دوران وہ شہر جاتی رہی اور مجھے شہر کے حالات کے بارے میں بتاتی رہی۔ چوتھے روز دوپہر کا وقت تھا۔ میں سرنگ کی بجائے اس کی تالاب والی کوٹھڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لینے شہر گئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئی تھی۔ اتنے میں مجھے وہ ایک طرف سے تیز تیز قدم اٹھاتی آتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ خراب ہے۔ اس نے آتے ہی کہا:۔

"جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ۔ جلدی کرو۔"

میں کوٹھڑی سے نکل کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ سرنگ کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف جھاڑیوں اور درختوں میں چل رہی تھی۔ اس نے کہا:۔

"کچھ بنگالیوں کو پتہ چل گیا ہے کہ میں نے تمہیں اپنے پاس چھپا رکھا ہے۔ وہ مکتی باہنی والوں کو لے کر ادھر آرہے ہیں۔"

ہم اس وقت ایک گھاٹی میں سے گذر رہے تھے۔ گھاٹی کی دوسری جانب ایک تالاب کے قریب سے نکل کر ہم کھیتوں میں آگئے۔ کھیت ختم ہوئے تو درختوں کے گھنے جھنڈ شروع ہو گئے۔ میں جوگن کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لئے جا رہی ہے۔ ایک جگہ ہم درختوں کے جھنڈ میں سے نکلے تو دریا کا کنارا آگیا۔ دریا کا پاٹ یہاں زیادہ چوڑا نہیں تھا اور دوسرے کنارے کے درخت صاف نظر آرہے تھے۔ یہاں جوگن بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگی:۔

"اگر میں شہر نہ جاتی تو وہ لوگ میری کوٹھڑی میں پہنچ کر مجھے بھی پکڑ لیتے اور تمہیں بھی سرنگ میں تلاش کر لیتے۔ اب میں بھی واپس نہیں جاسکتی۔ مکتی باہنی والے اب مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے پوچھا:۔ "اب ہم کس طرف جا رہے ہیں؟"

جوگن نے کہا:۔ "دھرتی بہت وشال ہے۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔"

میں نے کہا:۔ "کملاشی جی! تم میری خاطر اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ مجھے دریا پار کرا دو۔ میں کسی نہ کسی طرف نکل جاؤں گا۔"

وہ کہنے لگی:۔ "یہ تمہاری بھول ہے۔ تم جہاں بھی جاؤ گے مکتی باہنی تمہیں پکڑ لے گی۔ مکتی باہنی والے نہیں ہوں گے تو بنگالی تمہیں پکڑ کر مار ڈالیں گے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ میرے ساتھ رہو۔ میں بنگال کی رہنے والی ہوں۔ میں ان لوگوں کی زبان بھی جانتی ہوں۔ ان لوگوں کی خصلت سے بھی واقف ہوں اور ان علاقوں سے بھی مانوس ہوں۔"

جب میں نے اسے چٹاگانگ اور کاکسز بازار کے جنگلوں کی طرف نکل جانے کا مشورہ دیا تو اس نے کہا:۔

"اس طرف جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں اگر رانگامتی کی طرف چلے جائیں اور وہاں سے آسام کے صوبے میں داخل ہو جائیں تو ہم خطرے سے دور ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا:۔ "رانگامتی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

وہ بولی:۔ "رانگامتی چٹاگانگ سے آگے اوپر پہاڑی جنگلوں میں ہے۔ میں وہاں ایک سال گذار چکی ہوں۔ وہاں سے آسام کی سرحد بہت نزدیک ہے۔"

آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم رانگامتی جائیں گے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی:۔

"چلو ادھر گھاٹ پر سے دریا پار کرتے ہیں۔ دریا کے دوسرے کنارے پر رام گڑھ کا قصبہ ہے۔ وہاں سے ہمیں چٹاگانگ جانے والی ریل گاڑی مل جائے گی۔"

میں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

"ریل گاڑی میں سفر کرنا خطرناک ہو گا۔ میں تو صاف پہچانا جاؤں گا کہ بنگالی نہیں ہوں۔"

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مجھے یہ معلوم ہے۔ مگر تم اسکی فکر نہ کرو۔ رام گڑھ کا سٹیشن ماسٹر اور اسکی بیوی میرے چیلے ہیں۔ وہ ہمیں چٹاگانگ محفوظ طریقے سے پہنچانے میں ہماری مدد کریں گے۔"

مجھے اطمینان نہ ہوا۔ لگتا تھا کہ ایک بار پھر موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جوگن کے ساتھ چل پڑا۔ آگے دریا کا چھوٹا سا گھاٹ آگیا۔ یہاں ایک کشتی پر بیٹھ کر ہم نے دریا پار کیا اور رام گڑھ کے قصبے میں پہنچ گئے۔ یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بنگالی ماہی گیروں کا قصبہ لگتا تھا۔ ریلوے سٹیشن بھی چھوٹا سا تھا۔ پیچھے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ جوگن نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے مجھے سٹیشن سے باہر ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھنے کو کہا اور خود سٹیشن کے گیٹ کی طرف چلی گئی۔

میں وہیں بیٹھ گیا۔ میری پریشان نظریں چاروں طرف ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک تو میرا لباس بنگالیوں والا نہیں تھا۔ میں نے قمیض پتلون پہن رکھی تھی۔ دوسرے میرا رنگ اور نقش و نگار بھی بنگالیوں والے نہیں تھے۔ صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ میں بنگالی نہیں ہوں یا پنجابی ہوں یا پٹھان ہوں۔ لیکن یہ قصبہ مجھے بڑا پرسکون لگا۔ ہر آدمی محنت کش نظر آ رہا تھا۔ سٹیشن پر بھی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دبلا پتلا بنگالی جس نے ریلوے کی وردی پہن رکھی تھی، سٹیشن کے گیٹ سے نکل کر میری طرف آیا۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ ہوشیار ان معنوں میں کہ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہوا تو بھاگ جاؤں گا۔ یہ بنگالی میرے پاس آیا اور مسکراتے ہوئے بنگلہ اردو میں اس نے مجھ سے کہا:

"بھائی میرے ساتھ آؤ۔ دیوی جی نے مجھے تمہیں لینے کے لئے بھیجا ہے"۔

میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے سٹیشن کے پلیٹ فارم سے گذار کر پیچھے ایک ریلوے کوارٹر میں لے آیا۔ یہ سٹیشن ماسٹر کا کوارٹر تھا اور جو آدمی مجھے لے کر آیا تھا وہ رام گڑھ کا سٹیشن ماسٹر تھا۔ یہ ہندو بنگالی تھا مگر جوگن کا زبردست بھگت اور چیلا تھا۔ کوارٹر کے چھوٹے سے کمرے میں جوگن ایک تخت پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کی ایک جانب ایک عورت ہاتھ باندھے بیٹھی تھی۔ جوگن کے آگے مٹھائی کی طشتری پڑی تھی۔ سٹیشن ماسٹر مجھے لے کر آیا تو جوگن نے بنگلہ زبان میں اس سے باتیں شروع کر دیں۔ پھر جوگن نے میرا سٹیشن ماسٹر اور اس کی بیوی سے تعارف کرایا اور کہا:

"بکرم چند اور اس کی بیوی لاجونتی میرے اپنے بچوں کی طرح ہیں۔ میں نے انہیں ساری بات کھول کر بتا دی ہے۔"

بکرم چند سٹیشن ماسٹر کا نام تھا۔ اب وہ بنگلہ اردو میں مجھ سے کہنے لگا:

"یہاں سے رات کے وقت چٹاگانگ کو ایک مال گاڑی جاتی ہے۔ اگر تم مال گاڑی میں جاؤ گے تو محفوظ رہو گے۔ راستے میں تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا"۔

میں نے جوگن کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ہاں۔ میں تمہارے ساتھ آگے نہیں جاؤں گی۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میں یہاں سے کھلنا چلی جاؤں گی۔ تم چٹاگانگ اکیلے ہی جاؤ گے۔ مگر میں تمہیں رانگامتی تک جانے والے راستے کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔"

میں نے دل میں سوچا کہ چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس عورت کے کے ساتھ سفر کرنے میں کئی مشکلات پیش آسکتی تھیں۔

جوگن کے چیلے بکرم چند سٹیشن ماسٹر نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کی بیوی نے جلدی سے سبزی ترکاری کا سالن اور چاول تیار کئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ بکرم چند نے جوگن کے آگے ہاتھ باندھ لئے اور کہا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"دیوی جی! مجھے تھوڑی آگیا دیں۔ ٹرین کا ٹائم ہو گیا ہے۔ میرا سٹیشن پر پہنچنا ضروری ہے۔"

جوگن نے اسے اجازت دے دی۔ جب وہ چلا گیا تو یونہی میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ ہندو بنگالی پولیس کو یا وہاں پر موجود انڈین فوجیوں کو میرے بارے میں نہ بتا دے۔ میں پریشان ہو گیا۔ جوگن نے مجھے گہری نظر سے دیکھا اور بولی:۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بکرم چند بڑے بھروسے کا آدمی ہے۔"

اس جوگن نے خدا جانے میرے چہرے سے کیسے میرے دل کی پریشانی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ یہ عورت واقعی بڑی چہرہ شناس تھی۔ کیوں نہ ہوتی۔ اس نے یقیناً گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ لیکن میں اس کا دل میں بہت ممنون تھا کہ ہندو عورت ہوتے ہوئے بھی اس نے مجھے مکتی باہنی اور بنگالیوں سے بچائے رکھا تھا اور میری جان کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال لی تھی۔

شام کے وقت جوگن نے مجھے اپنے پاس تخت پوش پر بٹھایا اور رانگامتی کے بارے میں بتانے لگی:

"چٹاگانگ کے ریلوے سٹیشن پر اترو گے تو وہاں سے سٹیشن کی پچھلی جانب جو سڑک ہے اس پر آ جانا اور کسی سے پوچھ لینا کہ پٹوا کھالی کا لاری اڈہ کہاں ہے۔ وہاں سے تمہیں کھیرا ہاٹ کو جانے والی لاری مل جائے گی۔ کھیرا ہاٹ تم اتر جانا۔ وہاں سے جنگل میں سیدھا رانگامتی کو راستہ جاتا ہے۔ اس راستے پر دیہاتی لوگ چھکڑوں اور بیل گاڑیوں پر سفر کرتے رہتے ہیں۔ تم کسی بھی بیل گاڑی پر بیٹھ کر رانگامتی پہنچ جانا۔ رانگامتی سے شمال مشرق کی طرف آسام کی سرحد بالکل قریب ہی ہے۔ ایک بار تم

آسام میں داخل ہو گئے تو پھر محفوظ ہو جاؤ گے۔ آسام میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے اور وہاں مکتی باہنی بھی نہیں ہے۔"

جوگن نے مجھے بڑا پیچ دار اور پریشان کر دینے والا راستہ بتایا تھا۔ مگر اس سے مجھے کم از کم چٹاگانگ کے جنگلوں میں جانے کا راستہ ضرور معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں یہی طے کیا کہ چٹاگانگ کے جنگل میں پہنچ کر صوبہ آسام کی طرف جانے کی بجائے برما کی سرحد پار کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ بنگلہ دیش اور ساتھ ہی بھارت سے بھی نکل جاؤں۔

مال گاڑی رات کے ڈیڑھ بجے رام گڑھ کے سٹیشن سے روانہ ہوتی تھی۔ یہ گاڑی پیچھے سے آتی تھی اور سٹیشن پر کافی دیر ٹھہرتی تھی۔ سٹیشن ماسٹر رات کے بارہ بجے سٹیشن پر چلا گیا۔ میں اور جوگن جاگ رہے تھے۔ وہ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا:

"میں نے مال گاڑی کے ایک ڈبے میں تمہارے لئے خاصی جگہ بنا دی ہے۔ اب تم میرے ساتھ آ جاؤ۔"

جوگن نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگی:۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بھگوان سے پرارتھنا کروں گی کہ تم زندہ سلامت اپنے گھر واپس پہنچ جاؤ۔"

میں بکرم چند سٹیشن ماسٹر کے ساتھ سٹیشن کی طرف چل دیا۔ سٹیشن پر کوئی مسافر وغیرہ نہیں تھا۔ قلی بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک لمبی مال گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے آگے بھاپ سے چلنے والا انجن لگا تھا اور اس میں سے سسکار کی آواز نکل رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سٹیشن ماسٹر مجھے گاڑی کے دوسری جانب لے آیا۔ یہاں ایک ڈبے کا شٹر آدھا کھلا تھا۔ اس نے کہا:

"اس ڈبے میں کوئی سامان نہیں ہے۔ اس میں واپسی پر چٹاگانگ سے مال لوڈ ہو کر آئے گا۔ میں نے اندر پانی سے بھری ہوئی صراحی اور تھوڑے سے ابلے ہوئے چاول رکھ دیئے ہیں۔ تم کل رات کو چٹاگانگ پہنچو گے۔"

میں نے سٹیشن ماسٹر سے ہاتھ ملا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈبے کے ساتھ لٹکتی ہوئی زنجیر کو پکڑ کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ سٹیشن ماسٹر نے کہا:

"شٹر کو بند رکھنا۔ راستے میں بھی کہیں بلاضرورت نہ کھولنا۔ کسی سٹیشن پر ٹرین کھڑی ہو تو دروازہ ہرگز مت کھولنا۔"

میں نے ڈبے کے شٹر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ شٹر کے بند ہونے سے ڈبے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں وہیں جگہ سٹول کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کی لوہے کی دیواروں میں جہاں جہاں درزیں تھیں، ان میں سے پلیٹ فارم پر لگی ہوئی بتیوں کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس روشنی کی وجہ سے اندر تھوڑا تھوڑا اجالا سا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک صراحی پڑی تھی۔ صراحی کے اوپر مٹی کا پیالہ اوندھا رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک بنڈل سا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو وہ گرم تھا۔ یہ کیلے کے پتوں کا بنڈل تھا۔ اس میں گرم گرم ابلے ہوئے چاول تھے جن پر آلو کی بھرجی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بنڈل کو اسی طرح لپیٹ کر وہیں رکھ دیا۔ دروازے کی درزوں میں سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر دوسری طرف بجلی کے کھمبوں پر لگے ہوئے بلب روشن تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کیا میں چٹاگانگ جان بچا کر پہنچ سکوں گا۔ اگرچہ مال گاڑی میں بظاہر کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ یہ گاڑی کوئی مسافر گاڑی نہیں تھی کہ راستے میں مکتی باہنی والے یا انڈیا کی فوج کے سپاہی اسکی تلاشی لیتے۔ بکرم چند سٹیشن

ماسٹر نے بتایا تھا کہ بھارتی فوجی اور مکتی باہنی والے ڈھاکہ اور دوسرے شہروں سے بھاگے ہوئے پنجابیوں اور بہاریوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں۔ ریل گاڑیوں کی ہر سٹیشن پر چیکنگ ہوتی ہے۔ اور اگر اس میں کوئی بہاری یا غیر بنگالی سوار ہو تو اسے ٹرین سے اتار کر بال بچوں سمیت قتل کر دیا جاتا ہے اور جوان عورتوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے دھڑکا ضرور لگا تھا کہ راستے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مال گاڑی کی بھی کسی سٹیشن پر مکتی باہنی نے چیکنگ شروع کر دی تو میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔

میں اسی سوچ میں پریشان بیٹھا تھا کہ دور سے مجھے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر ٹرین کو دھچکا لگا۔ عجیب عجیب قسم کی چرچراہٹ کی آوازیں بلند ہوئیں اور ٹرین نے چلنا شروع کر دیا۔ باقی کی ساری رات ٹرین چلتی رہی۔ اس کی ایک ہی رفتار تھی۔ اسی رفتار پر ٹرین چلتی گئی۔ راستے میں کوئی سٹیشن آتا تو ریل کی پٹڑیوں کی زور زور سے آوازیں بلند ہوتی اور ٹرین وہاں رکے بغیر آگے نکل جاتی۔

دن نکل آیا۔ سورج کی روشنی دیواروں اور شٹر کی درزوں میں سے اندر آنے لگی۔ میں نے شٹر تھوڑا سا اوپر کر کے باہر دیکھا۔ ٹرین ہرے بھرے کھیتوں میں سے گذر رہی تھی۔ دور دور پہاڑیاں بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے شٹر تھوڑا سا کھلا ہی رہنے دیا۔ تازہ ہوا نے مجھے کافی تازہ دم کر دیا۔ میں نے کیلے کے پتوں کا بنڈل کھول کر تھوڑے سے چاول کھا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے دعا کی کہ یا اللہ میں خیریت سے چٹاگانگ پہنچ جاؤں۔ ایک جگہ ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی تو میں نے شٹر بند کر دیا۔ کسی سٹیشن پر گاڑی کو کھڑے ہونا تھا۔ سٹیشن آیا۔ ٹرین رک گئی۔ یہاں دیر تک گاڑی رکی رہی۔ باہر سے مجھے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے مال گاڑی کے کسی ڈبے میں سامان لادا جا رہا ہے۔ آخر ٹرین یہاں سے بھی روانہ ہو گئی۔ سارا دن گذر گیا۔ پھر رات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آ گئی۔ میں ڈبے میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ زیادہ تھکاوٹ محسوس ہوتی تو کسی وقت اٹھ کر خالی ڈبے میں ٹہلنے لگ جاتا۔

سٹیشن ماسٹر بکرم چند نے کہا تھا کہ یہ مال گاڑی رات کے وقت چٹا گانگ پہنچے گی۔ مگر رات گذرتی جا رہی تھی اور ٹرین رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میں نے شٹر اوپر کر کے باہر دیکھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ گاڑی کسی اور طرف تو نہیں جا رہی؟ ہو سکتا ہے راستے میں ٹرین نے روٹ بدل لیا ہو۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں امڈنے لگے۔ پھر سورج نکل آیا۔ باہر زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں بہت سے درخت آ جاتے۔ کہیں کھیت شروع ہو جاتے اور کہیں پانی کے تالاب نظر آنے لگتے۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اچانک ٹرین کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ اس وقت دور سے مجھے ایک کارخانے کی چمنی نظر آئی۔ اس کے بعد کارخانے کی دو تین عمارتیں گذر گئیں۔ ان عمارتوں میں سے چھوٹی بڑی چمنیاں اوپر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد آبادی کے مکان اور کوٹھیاں شروع ہو گئیں۔ میں نے جلدی سے شٹر بند کر دیا۔ کوئی بڑا شہر آ رہا تھا۔ ضرور یہ چٹا گانگ ہی ہو گا۔ وہاں مجھے بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ کونسا شہر آ رہا ہے۔ دل میں دعا مانگنے لگا کہ خدا کرے چٹا گانگ ہی ہو۔ ٹرین کی رفتار کافی سست ہو گئی تھی اور اسی رفتار سے وہ چلی جا رہی تھی۔ ریل کی پٹڑیوں کی کھڑ کھڑ زیادہ ہونے لگی۔ ٹرین کسی بڑے سٹیشن کے یارڈ میں سے گذر رہی تھی۔ مال گاڑیاں عام طور پر ریلوے سٹیشنوں کے یارڈ کی طرف اپنے مخصوص پلیٹ فارموں پر جا کر رکتی ہیں۔ یہ ٹرین بھی اسی طرف جا رہی تھی۔ آخر آہستہ ہوتے ہوتے ٹرین ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ میں نے دروازے والے شٹر کی درز کے ساتھ آنکھ لگا کر باہر دیکھا۔ باہر ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک انجن شنٹ کرتا قریب سے گذر گیا۔ ریلوے لائنوں کے پار مال

گوداموں کی ٹین کی ڈھلانی چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے آہستہ سے شٹر کو اوپر اٹھایا اور سر باہر نکال کر دائیں بائیں نگاہ ڈالی۔ یہ پلیٹ فارم کی دوسری سائیڈ تھی۔ اس طرف مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

میں اسی وقت ڈبے میں سے نیچے اتر گیا۔

بیٹھے بیٹھے میری ٹانگیں سخت ہو گئی تھیں۔ زمین پر پاؤں رکھا تو لڑکھڑا گیا۔ مگر سر پر موت کا خوف سوار تھا۔ جلدی جلدی ریلوے لائینوں کو پار کر کے سامنے جو مال گودام تھے اس طرف آ گیا۔ یہاں کچھ مزدور ریل کی پٹڑی پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ میں لوہے کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جنگلا ختم ہوا تو ریلوے یارڈ کی دیوار شروع ہو گئی۔ میں یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا کہ یہ کونسا ریلوے سٹیشن ہے مگر کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ پوچھتا تو یہ بھید کھل جاتا کہ میں بنگالی نہیں بول سکتا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے مجھے ایک جگہ زمین میں سے لوہے کا تختہ باہر نکلا ہوا دکھائی دیا۔ اس پر کچھ انگریزی کے نمبر لکھے ہوئے تھے اور اس پر انگریزی کے حروف سی ٹی جی لکھے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً چٹا گانگ کا ہی مخفف تھا۔ اب میں ریلوے یارڈ سے نکل کر باہر جانے کو بے تاب تھا مگر مجھے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک راستہ نظر آ گیا۔ یہاں دیوار میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ دروازے میں سے ایک بنگالی مزدور سائیکل اٹھا کر گزر رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے دروازے سے باہر نکل گیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ایک دیوار بنی ہوئی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ کس طرف جاؤں۔ پھر اللہ کا نام لے کر دائیں طرف چل پڑا۔ یہ سڑک ایک بازار میں نکل آئی۔ بازار میں ٹریفک جاری تھی۔ لوگ پھر رہے تھے۔ میں سٹیشن سے باہر آ چکا تھا۔ میں ایک جگہ بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا ہو گیا اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوچنے لگا کہ پٹوا کھالی کو جانے والی لاریوں کے اڈے کا کس سے پتہ پوچھوں۔ وہاں یہ حال تھا کہ جو کوئی بھی اردو بولتا تھا اسے بہاری سمجھ کر وہیں دھر لیا جاتا تھا۔ بنگالی مجھے آتی نہیں تھی۔ بنگلہ اردو میں پوچھتے ہوئے کسی سے ڈر لگ رہا تھا۔ ریلوے کا ایک گارڈ ہاتھ میں بید لئے نیکر پہنے میرے قریب سے گزرا۔ میں نے اس سے بے اختیار ہو کر پوچھا کہ پتوہ کھالی کا لاریوں کا اڈہ کس طرف ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اردو کے الفاظ کم سے کم بولوں۔ مگر بہر حال میں نے بنگلہ زبان میں نہیں پوچھا تھا۔ ریلوے کے گارڈ نے رک کر میری طرف گھور کر دیکھا اور بنگلہ میں کوئی بات کی۔ میں احمقوں کی طرح مسکرانے لگا اور کہا۔

"میں بنگلہ نہیں سمجھتا۔"

اس نے بنگلہ اردو میں ایک طرف سوٹی کا اشارہ کر کے کہا۔

"اس طرف جائے گا۔"

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا میں اس طرف چل پڑا۔ مگر اندر سے میں ہل گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس بنگالی کی نیت اچھی نہیں۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں پنجابی ہوں۔ چنانچہ چند قدم چلنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو بنگالی چوکیدار کچھ فاصلے پر کھڑے پولیس کے سپاہی کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں سڑک پار کر کے دوسری طرف نکل جانا چاہتا تھا مگر سڑک پر ایک دوسرے کے پیچھے گاڑیاں اور چھکڑے اور فوجی ٹرک گزر رہے تھے۔ اتنے میں پولیس کا سپاہی میرے پیچھے دوڑ پڑا۔ اب میرے لئے وہاں رکنا موت کو آواز دینے کے برابر تھا۔ میں بازار کی ٹریفک میں گھس گیا۔ ایک ٹرک سے بمشکل بچا۔ دوسری گاڑی کے نیچے آ رہا تھا کہ گاڑی نے زور سے بریک لگا دی۔ اسی دوران پولیس کے سپاہی نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں تھیں۔ میں ٹرکوں' گاڑیوں اور

چھکڑوں کے درمیان سے بھاگتا ہوا دوسری طرف نکل آیا اور سامنے والے بازار میں دوڑ پڑا۔

یہ بازار نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ یہ دو رویہ کوٹھی نما اک منزلہ مکانوں کے درمیان بنا ہوا راستہ تھا جو آگے جا کر بند ہو جاتا تھا۔ یہاں کوئی دکانیں بھی نہیں تھیں۔ مکانوں کے دروازے تھے جو چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں بنے ہوئے تھے۔ میں نے پیچھے ایک نظر گردن موڑ کر دیکھا۔ تین آدمی جنہوں نے خاکی وردیاں پہنی ہوئی تھیں مجھے بازار میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ مجھے اس وقت تک معلوم ہو چکا تھا کہ یہ راستہ آگے جا کر بند ہو جاتا ہے اور جہاں یہ راستہ بند ہوتا تھا وہاں کوئی دس فٹ اونچی دیوار تھی۔ گھبراہٹ میں مجھے اور تو کچھ نہ سوجھی۔ میں آخری مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ سامنے مکان کے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ بند تھا۔ میں مکان کی پچھلی طرف گیا تو ایک بنگالی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بنگلہ میں کچھ پوچھا۔ میں نے اردو میں کہا۔

"سر! پلیز مجھے بچا لیں۔ وہ میرے پیچھے لگے ہیں وہ مجھے مار دیں گے۔"

بنگالی جس نے عینک لگا رکھی تھی اخبار نیچے رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اردو میں بولا۔

"اس طرف وہ سامنے والے دروازے میں جاؤ۔"

سامنے مکان کے کسی کمرے کا عقبی دروازہ تھا جو آدھا کھلا تھا۔ میں اس میں گھس گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک خالی پلنگ بچھا تھا جس پر مچھر دانی کے چار بانس لگے تھے اور مچھر دانی لپیٹ کر اوپر ڈال رکھی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اتنے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے باہر آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ بنگلہ زبان میں تیز تیز گفتگو ہو رہی تھی۔ کوئی کچھ پوچھ رہا تھا۔ دوسرا کوئی جواب دے رہا تھا۔ ایک منٹ تک باہر سے سوال و جواب کی یہ آوازیں آتی رہیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اس دوران میں نے اٹھ کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی تھی۔

باہر سے کسی نے دروازے کو دھکیلا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ باہر سے کسی نے اردو میں کہا:

"دروازہ کھولو۔ میں ہوں۔ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔"

یہ مکان والا وہی آدمی تھا جو باہر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور جس نے مکتی باہنی والوں سے میری جان بچائی تھی۔ میں نے کنڈی اتار دی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر آ گیا۔ درمیانی عمر کا کالے رنگ کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ دھوتی کرتے میں تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولا:

"گھبراؤ نہیں۔ میں نے ان لوگوں کو آگے بھیج دیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس گھر میں پاکستانی فوج کا سپاہی داخل ہوا ہے۔ میں نے کہا۔۔۔ یہاں تو میں کب سے بیٹھا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ ساتھ والے مکان میں جا کر دیکھو۔۔۔ خوش قسمتی سے ان میں ریلوے کا ایک چوکیدار میرا واقف تھا۔ انہیں میری بات کا یقین ہو گیا اور وہ چلے گئے۔"

میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے اور سانس درست کرتے ہوئے کہا:

"آپ کی مہربانی ہے۔ بڑی مہربانی ہے۔"

وہ بولا: "ساتھ والے کمرے میں آ جاؤ۔ آؤ۔ گھبراؤ نہیں یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

ساتھ والا کمرہ سجا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ کھڑکیوں پر پرانے پردے گرے ہوئے تھے۔ کونے میں دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ریڈیو سیٹ رکھا تھا۔ اس آدمی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا:

"آرام سے بیٹھو بیٹا! اسے اپنا گھر ہی سمجھو' میں تمہارے لئے شربت لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس شخص نے میری جان بچائی ورنہ میرا بچنا مشکل تھا۔ وہ میرے لئے شربت لے کر آ گیا۔ مجھے شربت پلایا۔ میری جان میں جان آئی۔ وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا: "کیا تم فوج سے بھاگے ہوئے ہو؟"

میں نے کہا: "جی نہیں' میں فوجی نہیں ہوں۔"

وہ کہنے لگا: "تم شکل سے پنجابی لگتے ہو۔ کیا تم پنجابی ہو؟"

یہ آدمی بڑی صاف اردو میں بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا: "جی میں پنجابی ضرور ہوں لیکن پاکستانی فوج سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تم چٹاگانگ کیسے آ گئے؟ کیا تم اسی شہر میں رہتے تھے؟ اس شہر میں تو مکتی باہنی نے کسی پنجابی کو زندہ نہیں چھوڑا۔"

میں نے کہا: "جی نہیں سر! میں ڈھاکہ سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔"

اس نے تعجب کے ساتھ کہا: "تم اس طرف کیوں آ گئے؟"

میں نے کہا: "میں چٹاگانگ کے جنگلوں میں سے گزر کر برما میں داخل ہونا چاہتا تھا۔"

تب میں نے اسے اپنی ساری روداد سنا دی۔ وہ بڑے غور سے میری رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان سنتا رہا۔ درمیان میں وہ افسوس کے ساتھ سر بھی ہلاتا رہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ میری داستان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ جب میں اسے تمام واقعات سنا چکا تو وہ ہمدردی بھرے لہجے میں کہنے لگا:۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو کہ میرے مکان میں آ گئے۔ دوسرے کسی مکان میں جاتے تو وہ لوگ تمہیں پکڑ کر مکتی باہنی کے حوالے کر دیتے۔ یہاں میرے سوا سارے لوگ بڑے سخت متعصب بنگالی ہیں۔ انہوں نے کئی بہاریوں اور پنجابیوں کو پکڑ کر مکتی باہنی کے حوالے کیا ہے۔"

میں نے بے ساختگی سے پوچھا:۔ "سر آپ مسلمان ہیں ناں؟"

وہ مسکرایا:۔ "کیوں نہیں بیٹا۔ میں مسلمان بنگالی ہوں اور مشرقی پاکستان کا محب الوطن شخص ہوں، میں بنگلہ دیش کو نہیں مانتا۔ یہ ملک مسلمانوں نے بنایا تھا۔ اسکا نام مشرقی پاکستان تھا اور مشرقی پاکستان ہی رہے گا۔ تم دیکھ لینا۔"

میں بہت خوش تھا۔ میری ساری پریشانی دور ہو گئی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ میں نے کہا:۔

"سر! میری وجہ سے آپ پر تو کوئی مصیبت نہیں آ پڑے گی؟"

وہ سر کو نفی میں ہلانے لگا:۔ "نہیں بالکل نہیں، مصیبت بھی پڑی تو پھر کیا ہے۔۔۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ دوسرا مسلمان مصیبت میں ہو تو اس کی مدد کرے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ کسقدر نیک دل بنگالی ہے۔ کاش دوسرے بنگالی جن کو بھارت کے پراپیگنڈے نے گمراہ کر دیا ہے، وہ بھی ایسے ہی سچے محب وطن پاکستانی ہوتے۔ میں نے اسے کہا:۔

"سر! میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ پلیز آپ کوئی ایسا انتظام کر دیں کہ میں چٹاگانگ اور رانگامتی کے جنگلوں میں پہنچ جاؤں۔ وہاں سے میں برما کی سرحد میں داخل ہو جاؤں گا۔ ایک بار برما کے ملک میں پہنچ گیا تو پھر کراچی پہنچنا آسان ہو گا۔"

وہ کہنے لگا:۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں برما کی سرحد کراس کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔ ابھی تم آرام کرو۔ اتفاق سے آجکل میری بیوی اور اسکا بھائی یہاں پر نہیں ہیں۔ ورنہ اسکا بھائی پولیس کے آگے مخبری کر دیتا۔ وہ پنجابیوں کے سخت خلاف ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ آج کل میری بیوی کے ساتھ سلہٹ گیا ہوا ہے۔ تم یہاں آرام کرو۔ میں بازار سے تمہارے لئے ناشتہ لاتا ہوں۔"

میں نے کہا:۔ "شکریہ۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ پلیز آپ مجھے یہاں سے نکال کر کسی جنگل میں پہنچا دیں۔ آگے میں خود برما کی سرحد تلاش کر لوں گا۔"

میں سخت گھبراہٹ کے عالم میں تھا اور چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں چٹاگانگ شہر سے نکل کر جنگل میں پہنچ جاؤں۔ اس وقت جنگل مجھے سب سے پر امن جگہ لگ رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے کہا:۔

"بیٹا! اپنی گھبراہٹ دور کر دو۔ تم یہی سمجھو کہ اپنے انکل کے گھر میں ہو۔ اگر میری نیت تمہیں نقصان پہنچانے کی ہوتی تو میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے نہ کر دیتا۔۔۔ بالکل تسلی کے ساتھ یہاں رہو۔ میں آج ہی اپنے ایک دوست سے جا کر ملتا ہوں۔ وہ فاریسٹ آفیسر ہے۔ وہ تمہیں اپنی نگرانی میں چٹاگانگ کے جنگلوں میں نہ صرف پہنچا دے گا بلکہ برما کی سرحد بھی پار کرا دے گا۔"

میری بہت تسلی ہو گئی۔ وہ جاتے ہوئے بولا:۔ "میں ہوٹل سے ناشتہ لا رہا ہوں۔ جب سے میری بیوی سلہٹ گئی ہے، میں بھی بازار سے کھانا منگواتا ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ ویسے میں بھی باہر سے تالا لگا جاؤں گا۔"

وہ باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ میں نے بھی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور کمرے کی دیواریں اور سامان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھنے لگا۔ پھر اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آیا۔ یہاں ایک کتاب پڑی تھی۔ بنگلہ زبان کی کتاب تھی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اندر درگا دیوی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ ہندو دیوی دیوتاؤں کے بارے میں کوئی کتاب تھی۔ میں نے سوچا کہ مشرقی پاکستان میں مسلمان بنگالیوں پر ہندو کلچر کا کافی اثر ہے۔ چنانچہ یہ آدمی بھی مسلمان ہو کر ہندو دیوی دیوتاؤں کی کتابیں پڑھتا ہو گا۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ میں پہلے سے کمزور ہو گیا تھا۔ چہرے کا صاف رنگ بھی سانولا پڑ گیا تھا۔ میں نے کنگھی اٹھا کر بالوں میں پھیری اور جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے پر جمی ہوئی گرد کو صاف کیا اور دوسری جیب سے کرنسی نوٹ نکال کر گنے۔ یہ کل پچپن روپے تھے۔ میں نے انہیں تہہ کر کے جیب میں سنبھال کر رکھ لیا اور صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس بنگالی نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ آئے گا تو میں اس سے اسکا نام ضرور پوچھوں گا تاکہ مجھے یاد رہے اور پاکستان پہنچنے کے بعد اس کو شکریہ کا خط بھی لکھ سکوں۔

باہر سے تالا کھولنے کی آواز آئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اچانک یاد آیا کہ میں نے تو اندر سے چٹخنی لگا رکھی ہے۔ جلدی سے اٹھ کر چٹخنی کھول دی۔ وہ نیک دل، فرشتہ صفت انسان میرے لئے حلوہ پوڑی اور کچوریاں لے کر آیا تھا۔ اس نے کچن میں جا کر ساری چیزیں تھالیوں میں ڈالیں اور لے کر کمرے میں آ گیا اور بولا:۔

"میں نے چائے کے لئے پانی بھی رکھ دیا ہے۔"

وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے تسلی دیتا کہ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ یہاں تم بالکل ایسے ہی ہو جیسے کوئی اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ اس نے میرے ساتھ مل کر ناشتہ کیا۔ پھر وہ اندر سے چائے بنا کر لے آیا۔ چائے بڑی مزیدار

تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی اپنی پریشانیوں کو بھول گیا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اپنے محسن سے اسکا نام پوچھا۔ وہ ذرا رک گیا۔ پھر بولا:۔

"میرا نام کریم الدین ہے۔ میں چٹا گانگ میں پٹ سن کا چھوٹا موٹا کاروبار کرتا ہوں۔"

مجھے اس وقت بالکل خیال نہ آیا کہ یہ آدمی اپنا نام بتانے سے پہلے تھوڑا سا رک کیوں گیا تھا۔

☆☆☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چائے پینے کے بعد وہ بنگالی جس کا نام کریم الدین تھا' اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس گیا۔ اوپر جو دیوی دیوتاؤں والی کتاب پڑی تھی' اس نے اسے اٹھاکر دراز میں بند کر دیا اور دوسرے دراز میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کر میرے پاس آکر بولا:۔

"بیٹا تم سگریٹ پیتے ہو۔۔؟ اگر پیتے ہو تو مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی اس قسم کے حالات میں سگریٹ پینے سے آدمی کی طبیعت پر سکون ہو جاتی ہے۔"

میں نے تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا:۔

"جی شکریہ! ابھی کبھی پی لیتا ہوں۔"

اس نے سگریٹ میری طرف بڑھایا:۔

"تو ضرور پیو۔ اچھا سگریٹ ہے۔ یہ پاکستان کا بڑا اعلیٰ سگریٹ ہے۔ میں زیادہ سگریٹ نہیں پیتا۔ بس کھانے کے بعد پی لیتا ہوں۔"

میں نے ایک سگریٹ لے لیا۔ اس نے ماچس جلاکر میرا سگریٹ سلگایا۔ خود بھی سگریٹ لگایا اور کش لگاکر کہنے لگا۔ "اب ایسا ہے کہ میں اپنے دوست سے ملنے جاتا ہوں جو جنگلات کا افسر ہے۔ وہی تمہیں اپنی حفاظت میں برما کی سرحد پار کرا سکتا ہے۔ تم اتنی دیر آرام سے پلنگ پر سو جاؤ۔ بالکل بے فکر ہو کر سو جانا۔ میں باہر سے تالا لگا جاؤں گا۔ او کے بیٹا؟"

میں نے آہستہ سے کہا:۔ "جی او کے۔"

وہ باہر سے تالا لگاکر چلا گیا۔ حالات ایسے بن گئے ہوئے تھے کہ مجھے ہر کسی پر شک پڑنے لگا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہ آدمی شاید پولیس کو خبر کرنے گیا ہے۔ پھر خیال آتا کہ اگر اس نے مجھے پولیس کے حوالے کرنا ہوتا تو جب مکتی باہنی والے اس کے مکان میں آئے تھے اور انہوں نے میرے بارے میں پوچھا تھا کہ یہ اسی وقت مجھے ان کے حوالے کر دیتا۔ میں اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا کہ خواہ مخواہ میں ایک نیک دل محب وطن بنگالی کی نیت پر شک کرنے لگا تھا۔ بڑی دیر بعد سگریٹ پیا تھا۔ اس نے بڑا مزا دیا۔ سگریٹ پی کر میں نے اسے ایش ٹرے میں بجھایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو کر جو واقعات میرے ساتھ گذر چکے تھے' ان پر غور کرنے لگا۔ سارے واقعات ایک ایک کر کے فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگے۔ مجھے فیاض اور شاہد بٹ کا بار بار خیال آتا کہ خدا جانے وہ کہاں ہوں گے' کس حال میں ہوں گے۔ اللہ کرے کہ وہ محفوظ ہوں اور بنگلہ دیش سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

کئی راتوں سے اچھی طرح نہیں سویا تھا۔ آرام دہ پلنگ ملا تو نیند آنے لگی۔ دل مطمئن تھا۔ میں نے اپنا آپ نیند کے حوالے کر دیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب میرا محسن بنگالی مسلمان کریم الدین مجھے جگا رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا:۔

"مبارک ہو بیٹا! تمہارا کام بن گیا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر پوچھا:

"اچھا جی... مگر میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی مصیبت میں مدد کرے۔ میں نے تو اپنا فرض پورا کیا ہے۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا: "سر! کیا ابھی جانا ہوگا؟"

"ہاں بھئی۔۔۔۔ وہ جو فاریسٹ آفیسر دوست ہے ناں' میں نے اس کے ساتھ تمہاری ساری بات کرلی ہے۔ اتفاق سے وہ آج ہی شام کو واپس رانگامتی جارہا ہے۔ وہاں اس کا ریسٹ ہاؤس بھی ہے اور دفتر بھی ہے۔ تم کتنے خوش قسمت ہو کہ عین وقت پر میرے پاس آگئے۔ اگر کل آتے تو میرا دوست جاچکا ہوتا۔ پھر کم از کم میں تمہیں چٹاگانگ کے جنگلوں میں برما کی سرحد پار نہیں کرا سکتا تھا۔"

"ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے انکل؟ دن کا وقت ہے' مکتی باہنی والے مجھے دیکھ کر پکڑ لیں گے۔"

میری اس تشویش کے اظہار پر اس نے کہا: "اسکا بھی میں نے بندوبست کرلیا ہے۔ میرے پاس چھوٹی سی ویگن ہے جو چاروں طرف سے بند ہے۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو فون کردیا ہے۔ وہ گاڑی لے کر پہنچنے ہی والا ہوگا۔ وہ گاڑی چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ڈرائیور تمہیں دیکھے۔ میں خود تمہیں لے کر اپنے دوست کے مکان پر جاؤں گا۔ میں تمہیں اس کے حوالے کردوں گا۔ اس کی اپنی گاڑی ہے۔ وہ تمہیں شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد اپنی گاڑی میں بٹھا کر چٹاگانگ کے جنگلوں کی طرف روانہ ہو جائے گا۔"

ہر شے مجھے درست اور صحیح لگ رہی تھی۔ صرف ایک اندیشہ تھا کہ راستے میں کوئی ہماری گاڑی چیک نہ کرے۔ جب میں نے اپنے محسن سے اس اندیشے کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا:

"میری گاڑی کبھی کسی نے چیک نہیں کی' یہاں سب پولیس والے مجھے جانتے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی خدشہ ہے تو میں تمہیں ویگن کے پیچھے سیٹ کے نیچے چھپادوں گا۔ سیٹ کے نیچے کافی جگہ ہے۔"

میں نے کہا: "بالکل ٹھیک ہے۔ میں سیٹ کے نیچے چھپ جاؤں گا۔ احتیاط کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"بالکل کوئی حرج نہیں۔" وہ بولا۔ "اچھا اب تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو۔ کونے میں غسل خانہ ہے۔ میں تمہیں اپنی قمیض دیتا ہوں۔ تمہاری قمیض بہت گندی ہو رہی ہے۔"

میں غسل خانے میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو کریم الدین نے میرے لئے گہرے نسواری رنگ کی دھلی ہوئی قمیض نکال کر پلنگ پر رکھی ہوئی تھی۔

"اسے پہن کر دیکھو۔ میرا خیال ہے تمہیں پوری ہوگی۔ بس ذرا تنگ نہ ہو۔"

میں نے قمیض پہنی۔ وہ کچھ تنگ تھی۔ مگر میں نے کہا: "بالکل ٹھیک ہے۔"

میں قمیض پہن کر تیار ہو گیا تھا۔ کریم الدین کہنے لگا:

"ڈرائیور کو گاڑی لے کر ابھی تک آجانا چاہئے تھا۔"

اتنے میں باہر سے گاڑی کی آواز آئی۔ کریم الدین باہر کی طرف جاتے ہوئے بولا:

"تم ٹھہرو۔ میں ڈرائیور کو بھیج کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور کہنے لگا:

"سب ٹھیک ہے۔ میں نے ویگن کی پچھلی سیٹ نیچے سے خالی کردی ہے۔ اور وہاں دری بھی بچھادی ہے۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا۔ آجاؤ میرے ساتھ۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آگیا۔ ہم باغیچے والے دروازے سے گذر کر سڑک پر آئے تو باہر ایک چھوٹی سی ویگن کھڑی تھی۔ اسکا ایک دروازہ پیچھے کھلتا تھا۔ کریم الدین نے پچھلا دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں جلدی سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر آمنے سامنے دو سیٹیں تھیں۔ ایک سیٹ کے نیچے دری بچھی ہوئی تھی۔ میں سیٹ کے نیچے لیٹ گیا۔ کریم الدین نے باہر سے دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا۔ اس کے بعد ویگن وہاں سے چل پڑی۔

میں سیٹ کے نیچے سمٹ کر لیٹا ہوا تھا۔ ویگن چونکہ چٹاگانگ شہر کی سڑکوں پر سے گذر رہی تھی' اس لئے دھچکے نہیں لگ رہے تھے۔ کچھ دیر تک ہموار چلتے رہنے کے بعد ویگن کو ہلکے ہلکے دھچکے لگنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ویگن کسی شکستہ سڑک پر آگئی ہے۔ میں خاموشی سے سیٹ کے نیچے لیٹا رہا۔ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد پھر ہموار سڑک آگئی۔ پھر گاڑی موڑ گھوم کر جیسے کسی گیٹ میں سے گذری اور رک گئی۔ کریم الدین نے دروازہ کھول کر کہا۔

"اب بے شک باہر آجاؤ۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں سیٹ سے نکل آیا۔

ویگن ایک پرانی شکستہ سی اک منزلہ عمارت کے احاطے میں ایک طرف کھڑی تھی۔ عمارت کی پیشانی پر بنگلہ زبان میں کوئی بورڈ لگا ہوا تھا۔ میرا بنگالی محسن کہنے لگا:

"یہ سوشل ویلفیئر کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اب اسے میں نے اپنا دفتر بنالیا ہے۔ یہاں میرا وہ دوست بھی اکثر آکر رات بسر کرلیتا ہے جو تمہیں اپنے ساتھ رانگامتی لے جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔ وہ اندر ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔۔۔۔"

عمارت کے برآمدے سے ہوتے ہوئے ہم ایک جگہ سے ایک چھوٹی سی راہ داری میں آگئے۔ یہاں ایک بنگالی بندوق اٹھائے پہرے پر کھڑا تھا۔ کریم الدین نے اسے بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میرا خیال تھا کہ اندر کریم الدین کا وہ دوست بیٹھا ہوگا جس کے ساتھ مجھے رانگامتی جانا تھا۔ لیکن کمرے میں تین بنگالی بیٹھے تھے۔ انہوں نے گھٹنوں پر بندوقیں ڈال رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک ہرے رنگ کی فوجی وردی میں تھا۔ کریم الدین نے اندر داخل ہوتے ہری وردی والے بنگالی سے اپنی زبان میں کوئی بات کی۔

ہری وردی والے نے مجھ سے بنگلہ اردو میں پوچھا: "تم پنجابی ہو؟"

میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ تم پھنس گئے ہو۔ میں جواب دیتے ہوئے کچھ ہچکچایا تو ایک بنگالی نے اٹھ کر زور سے میرے کندھے پر بندوق کا بٹ مارا۔ میں صوفے کے آگے فرش پر گر پڑا۔ جو بنگالی مجھے اپنے ساتھ پھسلا کر وہاں لایا تھا اور جس کا نام کریم الدین نہیں تھا جو بعد میں معلوم ہوا کہ مسلمان بھی نہیں بلکہ ہندو بنگالی تھا۔ اس نے انگریزی میں ہری وردی والے سے کہا:

"سو فیصد پنجابی ہے۔ میری فیس لاؤ۔"

ہری وردی والے نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے جیب میں سے سو سو کے تین نوٹ نکال کر اسے دیئے۔ وہ غدار ہندو بنگالی غصے میں بولا:

"تم لوگوں نے پنجابی کو پکڑوانے کے پانچ سو روپے مقرر کر رکھے ہیں مجھے دو سو روپے اور دو۔"

ہری وردی والے نے اشارہ کیا۔ اس غدار ہندو بنگالی کو مزید دو سو روپے دیئے گئے۔ وہ چلا گیا۔ اب میں ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا جو یقینی طور پر مکتی باہنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فورس کے آدمی تھے۔ ہری وردی والے نے اپنے ساتھی کو بنگلہ میں کچھ کہا۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑا اور دھکیلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ یہاں فرش کے درمیان میں لکڑی کا کھمبا چھت تک گیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ زنجیر لٹک رہی تھی۔ میرے ایک پاؤں میں زنجیر ڈال کر مجھے اس کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ اس بنگالی نے باہر سے دروازے کو تالا لگا دیا تھا۔ میں اپنی بدقسمتی پر سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور مجھے ذبح کرنے کے لئے کسی کا انتظار کر رہے ہیں یا پھر کسی دوسری جگہ لے جاکر مجھے ذبح کر دیں گے۔ یہ بنگالی جس جس طرح سے پنجابیوں' پٹھانوں اور بہاریوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر رہے تھے' وہ میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چاقو سے آنکھیں کھرچتے' ناخن اکھیڑتے' جسم کا ایک ایک عضو آرام آرام سے کاٹتے' گردن کی شہ رگ کاٹنے کی بجائے نرخرہ کاٹ ڈالتے۔ مرنے والے بدقسمت کے گلے سے خر خر کی آواز آتی اور خون ابل ابل کر باہر گرتا تو یہ لوگ اسے دیکھ کر خوش ہوتے۔ کبھی کسی بہاری یا پنجابی کو زمین پر گرا دیا جاتا اور مکتی باہنی والے اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے اس کے جسم پر سنگین گھونپنے کی مشق شروع کر دیتے۔ یہ سوچ سوچ کر میرا سانس خشک ہو گیا تھا۔

اس بنگالی نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا۔ ہندو تھا۔ اسی لئے اس کے کمرے میں ہندو دیوی دیوتاؤں کی کتاب پڑی تھی اور جب میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اپنا مسلمانوں والا نقلی نام بتاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے رک گیا تھا۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا' ہو گیا تھا۔ اب آگے جو کچھ ہونے والا تھا' اس کے تصور سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔

میں سچی بات کہوں گا۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت موت کا خوف پوری طرح میرے اعصاب پر چھا چکا تھا اور میرے دل کی دھڑکن مدھم پڑنے لگی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خوف کے مارے آنسو بھی غائب ہو چکے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی وقت عمارت کے باہر یا کسی تہہ خانے میں لے جاکر مجھے قتل کر سکتے تھے۔ اپنے قتل کے خیال سے میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ کاش میں اس ہندو بنگالی کے گھر میں داخل نہ ہوتا۔ وہ تو جیسے جال پھیلائے بیٹھا تھا اور میں اپنے آپ اس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اس بوسیدہ سے کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سارا کمرہ خالی تھا۔ فرش پر بھی کچھ نہیں بچھا تھا۔ مجھے وہ پھانسی کی کوٹھڑی لگنے لگی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے مکتی باہنی کے آدمیوں کی باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ بنگلہ زبان میں بات کر رہے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں سر جھکائے' اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتا زنجیر کے ساتھ بندھے ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ خدا سے دعا ہی کر سکتا تھا اور دعا ہی کر رہا تھا کہ اے میرے پاک پروردگار مجھے ان ظالموں سے بچا لے۔ کمرے میں صرف ایک ہی چھوٹا سا روشندان تھا۔ اس میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں جو مکتی باہنی والے بیٹھے تھے' ان کے کمرے سے باہر نکلنے کی آوازیں آئیں۔ پھر دوسرے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے اپنے پاؤں کے ساتھ بندھی ہوئی زنجیر کو دیکھا۔ یہ لوہے کی تھی اور اسے میرے ٹخنے کے گرد لپیٹ کر موٹا تالا لگا دیا گیا تھا۔ میں نے اس میں سے اپنا پاؤں نکالنے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے۔ میں بے بسی کے عالم میں بیٹھا کبھی روشندان کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی ویران کمرے کے در و دیوار کو تکنے لگتا۔ میری حالت اس بھیڑ ایسی تھی جسے تھوڑی دیر میں ذبح کیا جانے والا ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روشندان سے جو روشنی اندر آ رہی تھی وہ آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی۔

مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ خوف کے مارے ویسے بھی میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اتنے میں دوسرے کمرے میں کچھ لوگوں کے داخل ہونے کی آواز آئی۔ میں ساکت سا ہو کر ان آوازوں کو سننے لگا۔ سمجھ گیا کہ مجھے ذبح کرنے والے جلاد آ گئے ہیں۔ اتنے میں دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھل گیا۔ دو بنگالی اندر آ گئے۔ یہ نئے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پٹ سن کا رسا تھا۔ دوسرے نے کاندھے پر بندوق ڈال رکھی تھی۔ انہوں نے میری زنجیر کھول دی۔ میری دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے باندھے اور کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ دوسرے کمرے سے گزارنے کے بعد وہ راہداری سے ہوتے ہوئے مجھے ایک زینے کے دروازے پر لے آئے جو نیچے کسی تہہ خانے کو جاتا تھا۔ بندوق والا بنگالی میرے پیچھے تھا۔ دوسرا بنگالی ہاتھ میں رسہ پکڑے مجھے کھینچ رہا تھا۔ نیچے ایک تہہ خانہ تھا۔ وہاں کمزور سا بلب چھت کے ساتھ لٹکا جل رہا تھا۔ لوہے کا ایک خالی پلنگ بچھا تھا۔ انہوں نے میری رسی کھول دی اور زور سے دھکا دے کر مجھے پلنگ پر گرا دیا اور بنگلہ زبان میں مجھے شاید گالیاں دیتے ہوئے تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا کر چلے گئے۔

میں پھانسی کی ایک کوٹھڑی سے نکل کر پھانسی کی دوسری کوٹھڑی میں آ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ مجھے قتل کرنے کے واسطے نہیں لے گئے تھے۔ مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت مل گیا تھا۔ میں وہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میرے دل نے صاف کہہ دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگنی شروع کر دو۔ تمہاری موت کا بہت وقت قریب آ گیا ہے۔ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ میں لوہے کے سرنگوں والے پلنگ پر سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھا تھا۔ اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہا تھا۔

کچھ معلوم نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ پیاس کے ساتھ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ مگر یہ بھوک ایسی تھی کہ ایک لمحے میں معدہ ڈوبتا ہوا دکھائی دیتا اور دوسرے ہی لمحے جیسے بھوک بالکل ہی غائب ہو جاتی۔ یہ موت کے خوف کا اثر تھا۔ میرا خیال ہے رات ہو گئی تھی کہ مجھے تہہ خانے کے زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی زینہ اتر رہا تھا۔ پھر کسی نے باہر لگا ہوا تالا کھولا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ میری موت کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ مجھے قتل کرنے کے لئے کسی جگہ لے جایا جا رہا تھا۔ یا اسی تہہ خانے میں مجھے ذبح کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ دروازہ کھلا اور بلب کی روشنی میں ایک عورت اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا ابھی میری زندگی کے کچھ لمحات باقی ہیں۔ یہ عورت مجھے قتل کرنے نہیں آئی تھی۔ اس نے میلی سی نیلے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ عمر ڈھل چکی تھی۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور تھالی پاس آ کر میرے قریب رکھ دی۔ وہ اپنے ساتھ پانی سے بھرا ہوا سلور کا لوٹا بھی لائی تھی۔

اس نے بنگلہ اردو میں کہا۔

"یہ کھا لو۔ پانی بھی پی لو۔ میں تھوڑی دیر بعد آ کر برتن واپس لے جاؤں گی۔

"

میں نے بے اختیار ہو کر اسکا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رحم طلب لہجے میں کہ۔

"بہن جی! مجھے ان لوگوں سے بچا لو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے ان سے بچا لو۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے ساکت نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر ہاتھ چھڑا کر بولی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس کو کھالو۔"

اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر میری طرف دیکھا اور اٹھ کر تہہ خانے سے نکل گئی۔ وہ دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگاتی گئی۔ میں نے تھالی کی طرف دیکھا۔ اس میں ابلے ہوئے چاول تھے۔ اوپر تھوڑا سا سالن تھا۔ میں نے لوٹے میں سے پانی کے دو تین گھونٹ پئے۔ میرے جسم میں تھوڑی سی جان آگئی۔ بھوک پیاس اور نیند تو آدمی کے ساتھ ہی لگی ہوتی ہے۔ میں نے تھوڑے سے چاول کھائے۔ ایک بار پھر پانی پی کر پلنگ پر بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔ اس عورت نے واپس برتن لینے آنا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اندر آنے کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ جب وہ برتن لینے اندر آئے گی تو اس کے سر پر کوئی چیز مار کر اسے بے ہوش کر دوں گا اور خود تہہ خانے سے بھاگ جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے باہر جا کر پکڑا جاؤں یا فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں بے چینی سے عورت کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میرے ہاتھ پاؤں کھلے تھے۔ میں اس عورت کا گلا دبا کر بھی اسے بے ہوش کر سکتا تھا۔ میں پلنگ سے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ زینے پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر دروازہ کھلا۔ یہ وہی عورت تھی۔ اس نے آتے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

"بولنا مت۔۔۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔"

صورت حال ایکدم بدل گئی تھی۔ میرے اعصاب پہلے تنے ہوئے تھے وہ ایکدم معمول پر آگئے۔ میں ایکدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس عورت نے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا دی اور پلنگ کی طرف آکر کہنے لگی۔

"پلنگ کو میرے ساتھ اس طرف ہٹاؤ۔"

میں نے اس کے ساتھ مل کر پلنگ کو ایک طرف ہٹایا۔ نیچے لکڑی کا فرش تھا۔ فرش کے اوپر پرانے بوریئے کا ٹکڑا بچھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے بوریا ایک طرف ہٹایا پھر ہاتھ پھیر کر ایک جگہ لگی ہوئی کیل تلاش کر کے اسے اوپر کو جھٹکا دیا۔ لکڑی کے فرش کا ایک چوکھٹا اوپر کو اٹھ گیا۔ کہنے لگی۔

"جلدی نیچے اترو۔ جلدی کرو۔"

میں نے چوکھٹے میں سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک زینہ تھا۔ زینے میں اندھیرا تھا۔ میں زینہ اترنے لگا۔ عورت بھی میرے پیچھے زینہ اترنے لگی۔ پندرہ سولہ سیڑھیوں کے بعد ہم ایک تنگ سرنگ میں آگئے۔ اب اس نے مجھے ہاتھ سے پیچھے کر دیا اور خود آگے ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے آؤ۔"

سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ خدا جانے اس تہہ خانے کے اندر تہہ خانہ کس نے بنایا تھا۔ اور کس مقصد کے لئے بنایا تھا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد سرنگ ایک طرف مڑ گئی۔ میں نے ایک ہاتھ عورت کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور احتیاط سے قدم اٹھا کر چل رہا تھا۔ عورت ایک جگہ رک گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ دیوار میں لگے ہوئے طاق کو کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سرنگ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا میں نمی اور عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طاق کھل گیا۔ طاق میں سے ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ ساتھ ہی تازہ ہوا بھی باہر سے آگئی۔ وہ طاق سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے آگیا۔ ہم جھاڑیوں میں نکل آئے تھے۔ میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ اوپر کھلا آسمان تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں موت کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا ہوں۔ عورت نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف جھاڑی کے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آگے ندی ہے۔ ہم ندی پار کر کے دوسرے کنارے پر ایک جگہ جا رہے ہیں۔ تم سے پہلے میں نے ایک مسلمان پنجابی لڑکی کو بھی وہاں پہنچایا تھا۔ راستے میں مجھ سے کوئی بات مت کرنا۔ بس خاموشی سے میرے پیچھے چلے آنا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور رات کے اندھیرے میں میرے آگے آگے چلنے لگی۔ مجھے اس کا ہیولا ہی نظر آ رہا تھا۔

ہم اونچی اونچی جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ اس کے بعد جھاڑیاں ختم ہوگئیں اور کھلی جگہ آگئی جہاں کالے کالے درخت سر اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ ان درختوں کے پیچھے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ جس کو وہ ندی کہہ رہی تھی وہ مجھے دریائے راوی کی طرح کا دریا لگا۔ اس نے یہاں پہلے سے ایک کشتی کنارے پر جھاڑیوں میں چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹی سی کشتی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں کشتی کو جھاڑیوں میں سے کھینچ کر ندی کے پانی میں لے آیا۔ ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ کشتی میں صرف ایک چپو تھا۔ وہ عورت خود کشتی چلانے لگی۔ وہ بڑی مہارت سے چپو چلا رہی تھی۔ پانی کا بہاؤ زیادہ تیز نہیں تھا۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس نے کشتی کو اوپر کھینچ کر وہیں چھوڑ دیا اور بولی۔

"یہاں سے آگے ایک سڑک آئے گی۔ اس کی دوسری طرف میری چھوٹی بہن کا کوارٹر ہے۔ میں نے پنجابی لڑکی کو وہیں چھپایا ہوا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ وہیں جا رہے ہو۔"

خدا نے میری دعا قبول فرمالی تھی۔ اس وقت میری جان بچ گئی تھی۔ ندی کے پار خدا جانے کس چیز کے کھیت تھے۔ ان میں دلدل ہی دلدل تھی۔ ہم کھیتوں کے درمیان جو اونچی منڈھ بنی ہوئی تھی اس پر چل رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد سڑک کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ ہم نے ایک جگہ سے سڑک تیزی کے ساتھ پار کی اور دوسری

طرف آگئے۔ یہاں ادھر ادھر کچھ کوارٹروں کے ہیولے نظر آئے۔ کسی کسی کوارٹر کے باہر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ وہ عورت ان کے پیچھے سے ہوتی ہوئی، مجھے ایک کوارٹر کے پاس لے گئی۔

کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ اس عورت نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا۔ جہاں ایک عورت پہلے سے کھڑی تھی۔ یہ اس عورت کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں مجھے ساتھ لے کر چھوٹے سے کمرے میں آگئیں۔ اس چھوٹے کمرے میں دھیمی روشنی والا بلب روشن تھا۔ یہاں میں نے چارپائی پر ایک گورے چٹے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی کو بیٹھے دیکھا جس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ مجھے حیرت انگیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

جو عورت مجھے ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں سامنے والے سٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کہنے لگی۔

"مجھے نہیں معلوم تمہارا کیا نام ہے۔ مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ تم پاکستانی مسلمان اور پنجابی ہو۔ میرا نام فاطمہ ہے یہ میری چھوٹی بہن نگینہ ہے۔ پنجابی لڑکی جو میرے پاس پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنا نام مجھے جمیلہ بتایا۔ میری چھوٹی بہن نگینہ اسے لڑکیوں کے ہوسٹل سے بچا کر یہاں لائی ہے۔ تمہیں میں اس لئے بھی مکتی باہنی والوں سے بچا کر لائی ہوں کہ تم اس مسلمان لڑکی جمیلہ کو اپنی حفاظت میں پاکستان اس کے ماں باپ کے پاس لے جاؤ گے۔ میں تم دونوں کو چٹا گانگ سے نکال کر کاکسز بازار پہنچانے کا انتظام کر دوں گی۔ آگے تمہیں اس لڑکی کو اپنے ساتھ بنگلہ دیش کا بارڈر پار کر کے برما کے ملک میں داخل ہونا ہو گا۔ برما کے ملک پہنچ کر تم کسی بھی شہر میں چلے جانا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہاں سرحدی شہروں پر مسلمان آباد ہیں۔ تم دونوں کو پاکستان پہنچانے میں ضرور مدد کریں گے۔ کیا تم یہ ذمہ داری اٹھانے پر تیار ہو؟۔"

میں نے فوراً کہا۔

"میں تیار ہوں۔ بالکل تیار ہوں۔"

فاطمہ نے اپنی چھوٹی بہن نگینہ سے بنگلہ زبان میں دو تین باتیں کیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"میں اب یہاں سے واپس اس مکان میں نہیں جاسکتی۔ تم دونوں اس کوارٹر میں چھپے رہو گے۔ خاص طور پر تم دن کے وقت کوارٹر سے ہرگز ہرگز باہر نہیں نکلو گے۔
"

میں نے کہا۔ "بہن جی! مکتی باہنی والوں کو جب پتہ چلا کہ تم مجھے بھگا کر لے گئی ہو تو کیا وہ یہاں نہیں پہنچ جائیں گے؟"

فاطمہ نے کہا۔ "نہیں ان لوگوں کو میری بہن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ میں اس کے پاس رہتی تھی۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا ہوا۔ میں ان کے پاس کچھ روز پہلے ہندو نوکرانی بن کر گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ پنجابیوں' پٹھانوں کو پکڑتے ہیں اور پھر انہیں وہاں سے چٹاگانگ کے ایک سکول میں لے جاکر باری باری ذبح کر دیتے ہیں اور جشن مناتے ہیں۔ تمہیں بھی صبح یہ لوگ وہاں لے جاکر قتل کرنے والے تھے۔ میں کسی نوجوان پنجابی مسلمان کو بچاکر یہاں لانا چاہتی تھی تاکہ وہ اپنی حفاظت میں اس مسلمان جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دے۔ میں اتنا ہی کر سکتی تھی اور میں نے اتنا ہی کیا ہے۔"

مجھے دوسرے چھوٹے سے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ یہاں فرش پر بستر لگا تھا۔ میں وہاں لیٹ گیا۔ فاطمہ بہن مجھے ساتھ لے کر یہاں آئی تھی۔ کہنے لگی:

"آرام سے سو جاؤ۔"

اگرچہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوا تھا لیکن موت کا خوف اور موت کی تلوار جو میرے سر پر لٹک رہی تھی' وہ ہٹ گئی تھی۔ میں نے چادر اوپر کر لی اور آنکھیں بند کر کے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسرے دن جب آنکھ کھلی تو کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں فاطمہ بہن آگئی۔

"اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ نگینہ نے ناشتہ تیار کر لیا ہے۔"

میں اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور ساتھ والے چھوٹے کمرے میں آگیا۔ وہاں مسلمان پنجابی لڑکی جمیلہ صف پر ایک طرف سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ میں خاموشی سے صف پر بیٹھ گیا۔ میں نے لڑکی سے کہا:

"جمیلہ بہن! میرا نام یہ ہے--- کیا تم چٹاگانگ کے ہوسٹل میں رہتی تھیں؟"

جمیلہ نے صرف اثبات میں سرہلایا۔ منہ سے کچھ نہ کہا۔ میں خاموش رہا۔ خدا جانے یہ مسلمان پنجابی لڑکی کس قسم کے ہولناک حالات میں سے گذر کر یہاں پہنچی تھی۔ میں نے اس سے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نگینہ ناشتہ لے کر آگئی۔ رات کے نمکین چاول اور چائے تھی۔ فاطمہ بھی آگئی۔ ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ اس دوران فاطمہ بہن نے کہا۔

"شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ سرحدوں پر ابھی تک جنگ ہو رہی ہے۔ مگر میں نے پتہ کر لیا ہے۔ کاکسز بازار کی طرف حالات اتنے خراب نہیں ہیں---"

میں نے پوچھا۔ "یہاں سے کاکسز بازار کتنی دور ہو گا... کیا ہم یہاں سے محفوظ ہو کر نکل سکیں گے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فاطمہ کہنے لگی:۔ "اسکا طریقہ بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ میرا بھائی محمود الحق شہر میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔"

"ہم کس وقت یہاں سے چلیں گے؟"

فاطمہ نے کہا:۔ "یہ ابھی مجھے بھی معلوم نہیں۔ محمود الحق سے بات کر کے بتاؤں گی۔ میں ابھی اس کے پاس جاؤں گی۔ وہ پرانی مارکیٹ کے پیچھے کوارٹروں میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ واپس آکر بتاؤں گی کہ یہاں سے ہمیں کب جانا ہو گا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ پنجابی لڑکی جمیلہ نے بڑے تھوڑے چاول کھائے تھے۔ فاطمہ نے اسے کہا:۔

"جمیلہ بیٹی! تھوڑا اور کھاؤ۔ اب فکر مت کرو۔ اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جاؤ گی۔"

جمیلہ نے دوپٹہ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ نگینہ بھی وہاں آگئی۔ وہ دونوں اسے حوصلہ دینے لگیں۔ فاطمہ نے اسے اپنے ساتھ لگالیا اور میری طرف دیکھ کر بولی:۔

"نگینہ کو بڑا افسوس ہے کہ ہوسٹل میں دوسری پنجابی لڑکیوں کو وہ مکتی باہنی والوں سے نہ بچا سکی۔ خوش قسمتی سے جمیلہ کا کمرہ ہوسٹل کا آخری کمرہ تھا۔ مکتی باہنی والے دوسرے کمروں میں لڑکیوں کو اٹھا رہے تھے۔ نگینہ وہاں کی ملازمہ ہے۔ اس نے بڑی بہادری دکھائی اور جمیلہ کو وہاں سے نکال کر لے آئی۔ اللہ ہمارے گناہ معاف کرے۔ بنگالی لوگ بھٹک گئے ہیں۔ انہیں ہندوؤں نے بھٹکا دیا ہے۔ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ مسلمان ہی مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے۔۔۔۔۔"

دن کے دس بجے کے قریب فاطمہ اپنے ٹیکسی ڈرائیور بھائی محمود الحق سے ملنے چلی گئی۔ نگینہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ میں اور جمیلہ چھوٹے سے کمرے میں

خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ جمیلہ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی تو وہ کچھ باتیں کرنا شروع ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا:۔

"جمیلہ بہن! مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ تم مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہو گئی ہو۔ فکر مت کرو۔ میں اپنی جان پر کھیل کر تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا کر رہوں گا۔"

میں جمیلہ سے اپنی مادری زبان پنجابی میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:۔ "تم چٹاگانگ میں کونسے کالج میں پڑھتی تھیں اور تمہیں مغربی پاکستان سے یہاں آکر ہوسٹل میں رہنے اور پڑھنے کی ایسی کونسی ضرورت تھی۔۔"؟

جمیلہ نے کہا:۔ "میں چٹاگانگ میڈیکل کالج کے فرسٹ ایئر کی سٹوڈنٹ ہوں۔ میرے والد صاحب چٹاگانگ میں ہی کاروبار کرتے تھے۔ میں نے نویں جماعت سے ایف ایس سی تک چٹاگانگ میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔"

میں نے اس کی بات روک کر کہا:۔

"پھر تو تمہیں بنگالی زبان آتی ہو گی"؟

اس نے کہا:۔ "بنگلہ زبان میں تھوڑی تھوڑی بول لیتی ہوں مگر سمجھ پوری طرح سے لیتی ہوں۔ ایک سال ہوا میرے والد کو کاروبار میں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ یہاں سے اپنا بزنس سمیٹ کر مغربی پاکستان میں وزیر آباد چلے گئے اور وہیں دوبارہ کاروبار کرنے لگے۔ ہم وزیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ چٹاگانگ میں ہمارے ایک رشتے دار کا گھر تھا۔ والد صاحب نے مجھے کہا کہ اب جبکہ تم میڈیکل کالج میں داخل ہو چکی ہو تو میں چاہتا ہوں کہ یہاں اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھو۔ پتہ نہیں لاہور میں داخلہ ملے یا نہ ملے۔ وہاں ایک سال ضائع بھی ہو سکتا تھا۔ یہاں تمہارے پھوپھا کا گھر ہے۔ تم وہاں رہ لینا۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ میں خود یہی چاہتی تھی۔ اس شہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں میری بڑی سیلیاں تھیں۔ میں نے والد صاحب سے صرف اتنی اجازت مانگی کہ مجھے میڈیکل کالج کے گرلز ہوسٹل میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ والد صاحب مان گئے اور میں میڈکل کالج کے گرلز ہوسٹل میں آ گئی۔ اپنی پھوپھی سے ہفتے میں ایک بار ضرور ملنے چلی جاتی تھی۔ والد صاحب وزیر آباد سے مجھے سارا خرچہ بھیج دیتے تھے۔ دن گذرتے گئے۔ میں نے ایف ایس سی پاس کر لیا۔ سیکنڈ ایئر میں چلی گئی۔ میں بڑی محنت سے پڑھائی کرتی۔ ہوسٹل کی دوسری لڑکیاں سینما وغیرہ دیکھنے چلی جاتی تھیں مگر میں کبھی نہیں گئی تھی۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ والد صاحب وزیر آباد سے مجھے لینے کے لئے چٹا گانگ آئے۔ میں نے کہا کہ میرے امتحان قریب ہیں۔ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہاں دوسری لڑکیاں بھی رہ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر جانا بھی ہوا تو امتحان دینے کے بعد کچھ دنوں کے لئے وزیر آباد آجاؤں گی۔ میرے پھوپھا نے بھی والد صاحب کو یہی مشورہ دیا کہ لڑکی اپنے شہر میں ہے۔ اپنے وطن میں ہے۔ اگر کوئی معمولی سی گڑبڑ ہوئی تو ہم اسے ہوسٹل سے گھر لے آئیں گے۔ والد صاحب صرف میرے امتحانات کی وجہ سے واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جاتے وقت میرے بارے میں پریشان تھے۔ ان کے جانے کے ایک مہینے کے بعد یہاں بہت زیادہ حالات خراب ہونے لگے۔ والد صاحب نے مجھے وزیر آباد سے فون کیا کہ اپنے پھوپھا کے ہاں چلی جاؤ۔ مجھے پھوپھا کے ہاں جانا اچھا نہ لگا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ ضرور چلی جاؤں گی' آپ بے فکر رہیں۔۔۔۔۔ پھر فوج نے شہر کا امن و امان بحال کر دیا۔ چاروں طرف سکون ہو گیا۔ لوگ پھر سے کاروبار کرنے لگے۔ جو لوگ مغربی پاکستان چلے گئے تھے' وہ بھی واپس آ گئے۔ حالات نارمل ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد انڈیا نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کر کے مکتی باہنی کے گوریلوں اور ہندو فوجیوں کو سفید کپڑوں میں مشرقی

پاکستان کی سرحدوں میں داخل کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے مشرقی پاکستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ والد صاحب کا صرف ایک فون مجھے وزیر آباد سے آیا۔ وہ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فوراً اپنے پھوپھا کے ہاں چلی جاؤ۔۔۔۔ مگر اب ہوسٹل سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہوسٹل کی ساری پنجابی اور بہاری لڑکیاں پریشان تھیں۔ کالج کا بنگالی سٹاف مکتی باہنی کے ساتھ مل گیا تھا۔ انہوں نے ہوسٹل کی ایک ایک لڑکی کے بارے میں بتا دیا تھا کہ کونسی لڑکی بہاری ہے' کونسی پنجابی ہے اور کس کس نمبر کے کمرے میں رہتی ہے۔ ایک دن اچانک مکتی باہنی کے غنڈوں نے ہوسٹل پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ ہندو بنگالی مکتی باہنی والوں کے ساتھ مل کر لڑکیوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ لڑکیاں تڑپ رہی تھیں۔ دہائی دے رہی تھیں مگر ان کی پکار سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی کہ ہمارے ہوسٹل کی ملازمہ نگینہ کسی طرح میرے پاس آ گئی۔ اس نے مجھے کمرے کی پچھلی کھڑکی سے نیچے جو درخت تھا' اس پر اتارا اور مجھے وہاں سے نکال کر یہاں اپنے گھر لے آئی۔ میں نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا گذر گئی تھی اور کیا گذرنے والی ہے۔۔۔۔۔"

جمیلہ خاموش ہو گئی۔ مجھے اس کی المناک داستان سن کر ان بہاری اور غیر بنگالی دوسری لڑکیوں کا خیال آ گیا جن کو مکتی باہنی والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ بھی شریف گھرانوں کی شریف بیٹیاں تھیں۔ ان کا سارا مستقبل ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے ایک نئی نسل کی بنیاد رکھنی تھی۔ خدا جانے ان کے ساتھ کیا گذر رہی ہو گی اور آگے چل کر ان کے ساتھ کیا گذرنے والی تھی۔ میں نے ڈھاکے میں ہی سن رکھا تھا کہ مکتی باہنی والے غیر بنگالیوں کی جوان لڑکیوں کو اٹھا کر کلکتے پہنچا دیتے ہیں جہاں انہیں قحبہ خانوں میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جمیلہ دوپٹے سے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔۔۔

"سوچتی ہوں اباجی' امی جان اور میرے بہن بھائی میرے بارے میں کس قدر پریشان ہوں گے۔"

میں نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا: "سب ٹھیک ہوجائے گا۔ انشاء اللہ تم جلد اپنے گھر اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے درمیان پہنچ جاؤ گی۔"

جمیلہ رندھی ہوئی آواز میں بولی: "جس طرح فاطمہ بہن کہتی ہے' کیا ہم بنگلہ دیش سے نکل کر ملک برما میں پہنچ جائیں گے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہمیں راستے میں ہی مکتی باہنی والے پکڑ لیں گے۔ اب تو انڈیا کی فوج بھی یہاں آگئی ہے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ شاید اب میں کبھی اپنے ماں باپ کے پاس نہ جاسکوں گی۔"

اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اسے سوائے باتوں کے ذریعے حوصلہ دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی حد تک بلکہ بہت حد تک اس کے خدشات درست تھے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ مکتی باہنی کے ساتھ لوٹ مار میں اب انڈیا کی فوج بھی شامل ہوگئی تھی۔ کاکسز بازار کی سرحدوں پر بھی بھارتی فوجیوں نے مورچے سنبھالے ہوئے ہوں گے۔ اور پھر ہمیں بڑے خطرناک جنگلوں میں سے گذرنا تھا۔ ہمیں جنگلوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بنگالی ہماری جان کے دشمن بن چکے تھے۔ کہیں کہیں محب وطن بنگالی موجود تھے مگر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون دشمن ہے اور کون دوست ہے۔۔۔

ایک گھنٹے بعد فاطمہ واپس آگئی۔

وہ سیدھی ہمارے کمرے میں آئی۔ اسے دیکھ کر اس کی چھوٹی بہن نگینہ بھی آگئی۔ فاطمہ نے صف پر بیٹھتے ہوئے کہا: "سارا بندوبست ہوگیا ہے۔ تم لوگوں کو آج

شروع رات اندھیرا ہوتے ہی یہاں سے نکل پڑنا ہوگا۔ محمود الحق یہاں نہیں آئے گا۔ میں تم دونوں کو ساتھ لے کر چٹاگانگ کے پرانے بازار والی مسجد کے پیچھے پہنچ جاؤں گی۔ وہاں محمود الحق گاڑی لے کر پہلے سے موجود ہوگا' وہ تمہیں وہاں سے ساتھ لے گا اور کاکسز بازار پہنچادے گا۔ وہاں تک جنگلوں میں ایک چھوٹی سی سڑک جاتی ہے۔ محمود الحق وہاں آتا جاتا رہا ہے۔ کاکسز بازار میں اس کا ایک دوست رہتا ہے۔ تم دونوں کو وہ اپنے دوست کے ہاں لے جائے گا۔ وہاں سے وہ دوست آگے تمہارا سرحد پار کرنے کا سارا انتظام کرلے گا۔ کیا تم تیار ہو؟ راستہ بڑا لمبا ہے۔ قدم قدم پر خطرہ ہے۔ راستے میں کچھ ہوسکتا ہے۔ تمہیں ان ساری مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ابھی سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا: "فاطمہ بہن! اس کے سوائے کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔"

فاطمہ کہنے لگی: "یہ راستہ بھی اس لئے غنیمت ہے کہ میرا بھائی یہاں سے کاکسز بازار تک تمہاری راہ نمائی کرے گا اور اس سے آگے میرے بھائی کا دوست تمہیں اپنی نگرانی میں برما کے سرحدی جنگل تک لے جائے گا۔ میرا خیال ہے اگر تم لوگوں نے ذرا ہمت سے کام لیا تو اس جہنم سے نکل جاؤ گے۔"

میں نے جمیلہ کی طرف دیکھا اور کہا: "تم خود جمیلہ بہن سے پوچھ کر دیکھ لو۔ کیا یہ راستے میں گھبرا تو نہیں جائے گی۔"

فاطمہ نے جمیلہ سے پوچھا تو اس نے کہا: "میں اپنے ماں باپ اور اپنے وطن پہنچنے کے لئے ہر قسم کی مشکلات برداشت کرلوں گی۔"

فاطمہ نے کہا: "تو ٹھیک ہے۔ معاملہ طے سمجھو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے فاطمہ سے پوچھا کہ ہمیں حلیہ بدلنے کی ضرورت تو نہیں ہوگی۔
اس پر اس نے جمیلہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: "جمیلہ ساڑھی پہن لے گی۔ اسکا پنجابی لباس تم دونوں کو کسی بھی جگہ مشکل میں ڈال سکتا ہے۔"

دن گذر گیا۔ شام ہوگئی۔ نگینہ نے ہمارے لئے چاول پکا رکھے تھے۔ ہم سب نے مل کر کھائے۔ اس نے ایک تھیلے میں کچھ بھنے ہوئے چاول ڈال کر ہمارے ساتھ لے جانے کے لئے بھی الگ رکھ دیئے۔ میں نے فاطمہ کو بتایا کہ میرے پاس پچاس کے قریب پاکستانی کرنسی موجود ہے۔ وہ کہنے لگی:

"اسکی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے کچھ روپے جمع کر کے رکھے ہوئے تھے' وہ میں نے راستے کے اخراجات کے لئے اپنے بھائی کو دے دیئے ہیں۔ وہ خود بھی کچھ روپے ساتھ لے کر چلے گا۔"

میں نے فاطمہ سے کہا: "فاطمہ بہن! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ جب تک زندہ رہا' تمہارے احسان کو یاد کر کے تمہیں دعائیں دیتا رہوں گا۔"

فاطمہ نے کہا: "ہاں مجھے دعاؤں میں ضرور یاد رکھنا۔ ویسے یہ میں اپنا فرض سمجھ کر کر رہی ہوں۔ ایک مسلمان مصیبت میں ہو تو دوسرے مسلمان کے لئے اسکی مدد کرنا فرض بن جاتا ہے۔"

اس نے جمیلہ سے کہا: "بیٹی تم تھوڑی تھوڑی بنگلہ زبان بول لیتی ہو۔ راستے میں مجھ سے بنگلہ میں ایک آدھ بات کر لینا۔ ہم یہاں سے پرانے بازار تک موٹر رکشا میں جائیں گے۔ اس سے رکشا والے کو یقین ہو جائے گا کہ تم بنگالی عورت ہو۔۔۔"

شام کا اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو فاطمہ نے جمیلہ کو اپنی ساڑھی نکال کر دوسرے کمرے میں لے جا کر خود پہنائی۔ اس کے ماتھے پر لال رنگ کی بندی بھی لگا دی۔ میری طرف دیکھ کر بولی:

"تمہاری یہ پتلون قمیض ٹھیک ہے۔ بنگالی لڑکے آج کل یہی لباس پہنتے ہیں۔ بس موٹر رکشا میں تم کوئی بات نہ کرنا۔ تم بنگلہ اردو بولو گے تو صاف پہچانے جاؤ گے کہ پنجابی ہو۔۔۔ میں اب موٹر رکشا لینے جا رہی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد نگینہ کہنے لگی: "یہاں سے اگر تم لوگ ٹیکسی میں گئے تو دوسروں کو شک پڑ سکتا ہے۔ اور شہر میں مکتی باہنی والے اور انڈیا کے فوجی ٹیکسیوں کی ضرور چیکنگ کرتے ہیں۔ موٹر رکشا کی طرف وہ زیادہ دھیان نہیں دیتے۔"

دس پندرہ منٹ بعد فاطمہ موٹر رکشا لے آئی۔ جمیلہ بڑی گرمجوشی سے نگینہ سے گلے ملی۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نگینہ نے جمیلہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "اللہ کے سپرد۔"

فاطمہ نے اشارے سے ہمیں باہر بلایا۔ ہم دونوں کوارٹر سے نکل آئے۔ موٹر رکشا ایک طرف کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے موٹر رکشا کافی کھلے ہوتے تھے۔ اس میں بڑی آسانی سے چار سواریاں بیٹھ جاتی تھیں۔ ہم خاموشی سے رکشے میں بیٹھ گئے۔ فاطمہ نے ڈرائیور سے بنگالی میں چلنے کو کہا۔ رکشا چل پڑا۔ چٹاگانگ کا شہر ڈھاکہ کے مقابلے میں بڑا صاف ستھرا اور کھلا کھلا شہر تھا۔ سڑکیں بھی کشادہ اور کھلی کھلی تھیں۔ وہاں زیادہ ٹریفک بھی نہیں ہوتی تھی۔ بازاروں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ سڑکوں پر زیادہ گاڑیاں وغیرہ دکھائی دیتی تھیں۔ موٹر رکشے چل رہے تھے۔ دکانوں کے باہر بنگلہ دیش کے پرچم لٹکے ہوئے تھے۔ بعض ریستورانوں میں سے بنگلہ گانوں کی ریکارڈنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موٹر رکشا کھلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھلے بازاروں سے ہوتا ہوا ایک چوک میں پہنچا۔ جمیلہ کو یاد آگیا کہ فاطمہ نے اس سے بنگلہ زبان میں بات کرنے کو کہا تھا۔ چنانچہ اس نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ جس کا جواب فاطمہ نے بنگلہ میں ہی دے دیا۔ دوسرے چوک میں پہنچ کر فاطمہ نے رکشا رکوالیا۔

اس نے جمیلہ کو بنگلہ میں شاید اترنے کے لئے کہا۔ جمیلہ فوراً رکشے سے اترنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اتر پڑا۔ مجھے بولنے سے منع کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں سارا راستہ خاموش رہا۔ فاطمہ نے رکشے والے کو پیسے دیئے۔ وہ چلا گیا۔ فاطمہ ہمیں لے کر چوک کراس کر کے سامنے والے بازار میں آگئی۔ کہنے لگی: "میں جان بوجھ کر کچھ دور پیچھے اتر گئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ رکشا والے کو پتہ چلے کہ ہم کس جگہ پر اترے ہیں۔ اس سارے علاقے کو پرانا بازار کہتے ہیں۔"

دو ایک بازاروں میں سے گذرنے کے بعد مجھے ایک جانب مسجد کا گنبد اور مینار دکھائی دیا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ سڑک پر جگہ جگہ انڈین فوجی کھڑے نظر آئے۔ فاطمہ نے آہستہ سے کہا: "ہم اس مسجد کے پیچھے جائیں گے۔ وہاں میرا بھائی گاڑی لئے کھڑا ہو گا۔"

ہم اوپر سے ہو کر مسجد کے عقب میں آگئے۔ یہاں ایک درخت کے نیچے ایک پرانی ویگن کھڑی تھی۔ اس کے پاس ایک آدمی بھی کھڑا تھا۔ فاطمہ نے قریب جا کر اس سے بات کی۔ اس نے جلدی سے ویگن کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ فاطمہ نے ہم دونوں کو اندر گھسنے کا اشارہ کیا۔ میں اور جمیلہ جلدی سے ویگن کے اندر چلے گئے۔ ویگن ایسی تھی کہ اس کا دروازہ پیچھے سے کھلتا تھا۔ اندر آمنے سامنے دو لمبی سیٹیں تھیں۔ درمیاں میں لکڑی کے فرش پر بوریا بچھا ہوا تھا۔ اس کی کھڑکیاں بالکل نہیں تھیں۔ آمنے سامنے چھوٹے چھوٹے دو روشندان بنے ہوئے تھے جن پر لوہے کی جالی

چڑھی ہوئی تھی۔ باہر فاطمہ اپنے بھائی سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ وہ بنگلہ زبان بول رہی تھی۔ پھر وہ ویگن کا دروازہ کھول کر اندر جھانکی اور کہنے لگی:

"میرے بچو! تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ خدا تمہیں خیر خریت کے ساتھ پاکستان پہنچا دے۔ وہاں جاکر ہمارے بھائی بہنوں کو کہنا کہ بنگالی مسلمان اب بھی پاکستانی مسلمان ہے۔۔۔ اللہ حافظ!"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میری آنکھوں میں فاطمہ بہن کی' اس دلیر مسلمان بنگالی عورت کی باتیں سن کر آنسو چھلک پڑے۔ یہ اپنے مسلمان بہن بھائیوں اور اپنے پیارے وطن پاکستان کی محبت میں چھلکے ہوئے آنسو تھے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ پاکستان دنیا کے ہر مسلمان کے دل میں بسا ہوا ہے اور دنیا کے ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

ویگن کے اندر ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ اس میں سے ہمیں فاطمہ کا بھائی محمود الحق بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر کہا:

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس روٹ پر ہم جائیں گے' ساری رات اس پر ٹرکوں کی ٹریفک جاری رہتی ہے۔ میں نے اپنے پاس ریوالور بھی رکھ لیا ہے۔۔۔"

جمیلہ میرے پاس ہی سیٹ پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ کہنے لگی:

"کیا راستے میں خطرہ ہے؟ اس نے ریوالور کیوں رکھا ہے۔۔۔"

بے چاری گھبرا رہی تھی۔ جس لڑکی نے ساری زندگی گھر سے باہر قدم نہ رکھا ہو اور اس قسم کے حالات سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو' وہ دنیا کے دوسرے بڑے جنگل میں جا رہی تھی۔ میں نے اسے کہا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"راستے میں ہو سکتا ہے کوئی گیدڑ یا کوئی جنگلی جانور آ جائے۔ اس لئے محمود الحق نے ریوالور ساتھ رکھ لیا ہے۔"

جمیلہ نے پوچھا۔ "ہم کتنی دیر میں کاکسنر بازار پہنچیں گے؟"

مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ میں نے اونچی آواز میں محمود الحق سے پوچھا تو وہ بولا۔ "ہم تین گھنٹوں میں ڈھاک بازار پہنچیں گے۔ اس کے بعد چرنگا اور اس کے آگے کاکسنر بازار آئے گا۔ آج کی رات اور کل کا دن اور رات لگ جائے گی۔"

جمیلہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔ میں نے محمود الحق سے کہا۔ "مگر ہمیں تو رانگا متی کی طرف جانا تھا۔"

اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "رانگا متی کا روٹ دوسری طرف ہے۔ اس طرف سے آسام میں تم لوگ داخل ہو سکتے تھے۔ مگر ادھر بھی خطرہ ہے۔ وہ انڈیا کا علاقہ ہے۔ وہاں تو زیادہ خطرہ ہے۔ کاکسنر بازار والا روٹ تمہیں ٹھیک رہے گا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "ایسی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کاکسنر بازار میں میرا جو دوست رہتا ہے، وہ تمہیں آگے برما کی سرحد تک چھوڑ آئے گا۔"

ویگن چٹاگانگ کی سڑکوں پر چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کے سامنے والی کھڑکی میں سے سڑک کی روشنیاں نظر آ جاتی تھیں۔ سڑک پر گاڑیاں، رکشے اور سکوٹر چل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سڑک کی ٹریفک کم ہوتی گئی۔ ہماری ویگن شہر سے باہر نکل آئی تھی۔ یہاں زمین ہموار نہیں تھی۔ کبھی ہلکی سی چڑھائی آ جاتی۔ کبھی گاڑی ڈھلان میں اترنی لگتی۔ آہستہ آہستہ سڑک ایک بار پھر ہموار ہو گئی۔ اب سڑک پر سے کسی کسی وقت آگے سے کوئی بھاری ٹرک آ کر گذر جاتا تھا۔ یا پیچھے سے کوئی ٹرک ہارن دیتا۔ محمود ویگن ایک طرف کر لیتا اور ٹرک ہمیں ٹیک اوور کر کے آگے نکل جاتا۔ ابھی تک

کسی جگہ ہمیں چیکنگ کے لئے نہیں روکا گیا تھا۔ دو تین چوک آ کر گذر گئے تھے۔ محمود الحق نے اونچی آواز میں کہا۔

"ہم چٹاگانگ شہر سے نکل آئے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

اس کے بعد سامنے سے بڑے بڑے درخت آ کر شاں شاں کرتے پیچھے کو نکل جاتے۔ سڑک بھی اتنی کشادہ اور صاف نہیں تھی۔ کہیں کہیں ٹائروں کے نیچے روڑے اور پتھر آنے لگے تھے۔ میں نے محمود الحق کو آواز دے کر پوچھا۔

"کیا ہم کسی جنگل میں سے گذر رہے ہیں؟؟"

اس نے جواب میں ہنس کر کہا۔ "نہیں، جنگل چرنگا کے بعد شروع ہو گا۔ جنگل آئے گا تو گاڑی اتنی تیز نہیں چلا سکوں گا۔۔۔ یہاں کے جنگل بڑے گھنے ہیں۔ جن دنوں جنرل اعظم خاں ہمارے گورنر تھے انہوں نے یہ سڑک بنوائی تھی۔ ورنہ پہلے یہاں سے بیل گاڑیاں بھی مشکل سے گذرتی تھیں۔"

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ویگن رات کے سناٹے میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اڑھائی، تین گھنٹے کے سفر کے بعد مجھے ڈرائیور کی کھڑکی میں سے کچھ روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ میں نے محمود سے پوچھا:

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

اس نے کہا: "یہ ڈھاک بازار آگیا ہے۔"

ڈھاک بازار چھوٹا سا نیم پہاڑی شہر تھا۔ ٹیلوں کی ڈھلان پر اونچے نیچے مکانوں پر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک بڑا بازار تھا۔ بازار کے شروع میں ایک بڑی ندی کے پل پر سے گذرنا پڑا۔ یہ بانس کا پل تھا مگر بڑا مضبوط تھا۔ بازار میں سے گذرنے کے بعد محمود الحق نے گاڑی ایک نسبتاً غیر آباد جگہ پر کھڑی کر دی۔ جمیلہ راستے میں سیٹ پر بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی۔ گاڑی رکی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے کہا: "ڈھاک بازار آگیا ہے۔"

محمود الحق نے پیچھے آکر ویگن کا دروازہ کھول دیا۔ اندر تازہ ہوا کے جھونکے داخل ہونے لگے۔ اس ہوا میں دریائی گھاس اور مچھلیوں کی ہلکی ہلکی بو تھی۔ کہنے لگا:

"باہر نکل کر چل پھر لو۔ زیادہ دور مت جانا۔ بس گاڑی کے آس پاس ہی رہنا۔ میں چائے لے کر آتا ہوں۔"

اس کے ہاتھ میں کیتلی تھی۔ وہ بازار کی طرف چلا گیا۔ میں اور جمیلہ ویگن سے باہر نکل آئے اور آہستہ آہستہ درختوں کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دور جاکر واپس آگئے۔ یوں ہم نے دو تین چکر لگائے تو ہماری ٹانگوں میں خون کی گردش معمول پر آگئی۔ اتنے میں محمود الحق آگیا۔ کہنے لگا: "ویگن میں ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ میں تمہارے لئے چائے کے ساتھ کھانے کو رس گلے بھی لایا ہوں۔"

ہم ویگن کے اندر فرش پر جو بوریا بچھا تھا' وہاں بیٹھ گئے۔ محمود نے تین گلاسوں میں چائے ڈالی۔ رس گلوں کا کاغذ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ ہم چائے پینے اور رس گلے کھانے لگے۔ رس گلے بڑے مزیدار تھے۔ جمیلہ نہیں کھا رہی تھی۔ ہم نے زبردستی اسے ایک رس گلا کھلایا۔ چائے نے ہمیں پھر سے چاق و چوبند کر دیا۔ بدن پر جو تکان طاری تھی' وہ دور ہو گئی۔ محمود الحق کہنے لگا:

"یہاں سے آگے لمبا سفر ہے۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بج چکے ہیں۔ ہم کل دن کے دس گیارہ بجے چر نگا پہنچیں گے۔"

جمیلہ خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے کہا: "کیا ہم جنگلوں میں سے گذریں گے۔؟"

"کسی حد تک۔۔۔۔ دراصل سندر بن کے جنگل چر نگا سے آگے شروع ہوتے ہیں۔ یہاں تک تو پھر بھی سڑک چھوٹی ہو کر بھی ٹھیک حالت میں ہے۔ چر نگا سے آگے جنگل ہیں' ان میں سے جو سڑک گذرتی ہے' وہ کچی ہے۔ راستہ تو بنا ہوا ہے۔ مگر رات کے وقت اس پر لوگ سفر نہیں کرتے۔ راستہ کو شیر آجاتے ہیں۔"

جمیلہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا: "ہم رات کو سفر نہیں کریں گے۔"

محمود الحق بولا: "ہاں! دن کے دن سفر کریں گے اور رات ہوگی تو کسی جگہ پڑ رہیں گے۔ اس سارے علاقے میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور جھونپڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آباد ہیں۔ کھانے پینے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ رات گذارنے کو کوئی خالی جھونپڑی بھی مل جائے گی۔"

چائے پی چکے تھے۔ آرام بھی کر لیا تھا۔ محمود الحق کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

وہ چائے کی خالی کیتلی لے کر گاڑی کی اگلی سیٹ کی طرف چلا گیا جانے سے پہلے اس نے ویگن کا پچھلا دروازہ بند کر کے مجھے ہدایت کی کہ میں اندر سے چٹخنی لگالوں۔ اس سے پہلے وہ خود باہر سے کنڈی چڑھا جاتا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ پتہ نہیں اس نے اب ایسا کیوں کیا ہے۔ بہر حال میں نے اٹھ کر ویگن کے عقبی دروازے کی کنڈی لگادی۔ ویگن سٹارٹ ہوئی اور اس نے اپنا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں ایک دریا آیا۔ گاڑی اس کے پل پر دیر تک چلتی گئی۔ کافی بڑا دریا تھا۔ محمود الحق نے اس دریا کا کوئی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کے بعد ایک اور دریا آگیا۔ اسکا پل اتنا لمبا نہیں تھا۔ گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ کیونکہ سڑک اب زیادہ کشادہ نہیں رہی تھی۔ کسی کسی وقت کوئی گاڑی آگے سے آکر پیچھے نکل جاتی تھی۔ ویگن کے اندر اندھیرا تھا۔ مگر ہماری آنکھیں اب اس اندھیرے کی عادی ہوگئی تھیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی شکل نظر آرہی تھی۔ میں نے جمیلہ سے کہا:

"جمیلہ بہن! تم سیٹ پر سو جاؤ' اس طرح کب تک بیٹھی اونگھتی رہوگی"

وہ خاموشی سے دوسری طرف منہ کر کے سیٹ پر سمٹ سمٹا کر لیٹ گئی۔ بے چاری کب کسی غیر مرد کے سامنے اس طرح سوئی ہوگی۔ مگر ہم قیامت خیز حالات میں سے گذر رہے تھے۔ میں نے محمود الحق سے کہا:

"محمود بھائی! تمہیں تو نیند نہیں آرہی؟ میں تو سونے لگا ہوں۔"

محمود الحق نے گردن ذرا سی پیچھے کی طرف گھما کر کہا:

"ہم ڈرائیور لوگ ہیں بابو۔ ہمیں راتوں کو جاگ کر گاڑی چلانے کی عادت ہے۔ تم سو جاؤ۔ جمیلہ بہن کو بھی کہو کہ سو جائے' راستہ لمبا ہے۔۔۔"

میں اپنی سیٹ پر لیٹ گیا۔ گاڑی کے ہلکے ہلکے جھکولوں میں مجھے بھی نیند آگئی۔ راتوں رات ہماری ویگن چٹا گانگ کی ہل ٹریکس میں داخل ہو چکی تھی۔ صبح جس وقت میری آنکھ کھلی تو ڈرائیور کی کھڑکی اور ویگن کے روشندان میں سے دن کی روشنی آرہی تھی۔ ویگن میں جو ٹھنڈی ہوا داخل ہو رہی تھی' اس میں دیودار درختوں کی گیلی گیلی ٹھنڈی خوشبو تھی۔ جمیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ محمود الحق نے مجھے دیکھ کر کہا:

"کہو رات کیسی گذری؟"

میں نے کہا: "خوب سوتا رہا۔ مگر تم ابھی تک کیسے جاگ رہے ہو؟"

محمود الحق ہنس کر بولا: "ہم راتوں کو گاڑی چلانے والوں کے ساتھ ایک عجیب بات ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ راستہ صاف ہو۔ آگے کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ہم گاڑی چلاتے چلاتے سو جاتے ہیں۔ میں بھی رات بھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سو جاتا تھا۔"

میں نے دیکھا کہ ہماری ویگن گھنے درختوں کے درمیان سے گذر رہی تھی اور اسکی رفتار بہت ہلکی تھی۔ میں نے محمود الحق سے پوچھا: "کیا ہم سندر بن کے جنگلوں سے گذر رہے تھے۔"

وہ بولا: "سندر بن کے جنگل چرنگا کے بعد شروع ہوں گے۔ لیکن بڑے جنگل کے شروع کا علاقہ ہے۔ آگے ایک گاؤں آئے گا۔ ہم وہاں ناشتہ کریں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ راستے میں بھارتی فوجیوں سے شرف ملاقات نہیں ہوا۔۔۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتنی دیر میں جمیلہ بھی جاگ پڑی تھی۔ وہ کلمہ شریف پڑھتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم چٹا گانگ کے گھنے جنگلاتی سلسلے کے علاقے میں داخل ہوگئے ہیں۔"

وہ بولی:۔ "کاکسز بازار کتنی دور ہے؟"

محمود الحق نے کہا:" وہ ابھی کافی دور ہے۔ لیکن ہم خیریت سے پہنچ جائیں گے۔ میرا خیال ہے اگر راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوئی تو کل اس وقت ہم کاکسز بازار میں ہوں گے۔"

جنگل کا راستہ تنگ اور غیر ہموار تھا۔ مگر محمود الحق ان راستوں سے خوب واقف تھا۔ وہ بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک گاؤں آگیا۔ گاؤں کیا تھا' دائیں بائیں درختوں کے نیچے دس بارہ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ کچھ ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی جھونپڑی کے باہر بیٹھا تمباکو پی رہا تھا۔ محمود الحق نے ویگن ایک طرف کھڑی کر دی۔ وہ اتر کر ہماری طرف آیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کہنے لگا:۔

"تم بھی اتر کر ٹانگیں سیدھی کر لو۔ یہاں ان درختوں کے پاس ایک ندی بہتی ہے۔ وہاں جاکر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں اتنی دیر میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

میں نے کہا:۔ "بھنے ہوئے چاولوں کا تھیلا میرے پاس اسی طرح پڑا ہے جو نگینہ بہن نے ہمیں دیا تھا۔"

محمود الحق ہنس پڑا:۔ "نگینہ بہن بھنے ہوئے چاول بڑے اچھے بناتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں صرف چائے بنوا کر لاتا ہوں۔ یہاں کے لوگ مجھے جانتے ہیں"۔

میں اور جمیلہ اس طرف چل پڑے جدھر محمود الحق نے کہا تھا کہ آگے ندی ہے۔ وہاں کیلے کے بڑے درخت تھے۔ کئی درختوں پر زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ پاس ہی ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ہم نے ندی کے پانی میں اچھی طرح سے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر کچھ کیلے توڑ کر کھائے۔ بڑے میٹھے کیلے تھے۔ واپس آئے تو محمود الحق کیتلی میں چائے لے کر آگیا ہوا تھا۔ ہم ویگن کے باہر ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں نے بھنے ہوئے چاول تھیلے سے نکال لئے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر چاول کھائے۔ چائے پی اور اس کے بعد آگے روانہ ہوگئے۔ وہ سارا دن بھی سفر میں گزر گیا۔ اب ہم چٹا گانگ ہلز کے گھنے جنگلاتی علاقے میں سے گزر رہے تھے۔ رات کا اندھیرا چھانے لگا تو ہم نے ایک جھیل کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی۔ محمود نے کہا:۔

"ہم یہاں رات گزاریں گے۔ ان جنگلوں میں رات کے وقت سفر خطرناک ہوتا ہے۔"

ہم نے وہیں ایک جگہ آگ کا الاؤ روشن کر دیا۔ اس کی وجہ سے ایک تو جنگلی جانوروں کے اس طرف آنے کا خطرہ باقی نہیں رہتا تھا' دوسرے آگ کے دھوئیں سے مچھروں سے بھی نجات مل گئی۔ میں اور محمود الحق الاؤ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جمیلہ ویگن میں جاکر سو گئی تھی۔ میں نے محمود سے کہا:۔

"راستے میں ایک جگہ میں نے دو تین دھماکوں کی آواز سنی تھی۔ کیا تم نے بھی سنی تھی؟"

محمود نے کچھ سوچ کر کہا:۔ "ہاں ایسی آواز میں نے بھی سنی تھی۔ میرا خیال ہے پیچھے سڑک پر جنگل میں کسی گاڑی کا ٹائر وغیرہ پھٹ گیا ہوگا۔"

میں نے کہا:۔ "ٹائر ایک پھٹتا ہے' اکٹھے دو تین دھماکے نہیں ہو سکتے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس طرف بھارتی فوج کے مورچے ہیں۔ وہ مارٹر توپوں کے فائر تھے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محمود بھی غور کرنے لگا۔ بولا:۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے ایک جگہ جنگل میں درختوں کے ساتھ ساتھ تین چار فوجی گاڑیوں کو کھڑے دیکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس طرف برما کے باڈر پر بھی بھارتی فوج پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس اعتبار سے تو تم لوگوں کا برما بارڈر کراس کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

قدرتی طور پر میں فکر مند ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ برما کا بنگلہ دیش کے ساتھ لگا ہوا اتنا لمبا بارڈر ہے۔ کسی نہ کسی جگہ سے بارڈر کراس کر لیں گے۔ جب میں نے اپنا یہ خیال محمود پر ظاہر کیا تو وہ کہنے لگا:۔

"تمہارے ساتھ لڑکی ہوگی۔ تم اتنی آزادی سے نقل و حرکت نہیں کر سکو گے۔ تمہیں ہر قدم پر اس کا خیال رکھنا ہو گا۔"

میں نے کچھ پریشان سا ہو کر محمود سے پوچھا:۔ "پھر تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟"

وہ سوچنے لگا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ ایک سگریٹ اس نے مجھے دیا۔ کہنے لگا:۔

"میری صلاح پوچھتے ہو تو میں تمہیں کاکسز بازار سے برما کے بارڈر کی طرف جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ہم جو سوچ کر آئے تھے، مجھے ویسے حالات یہاں نہیں لگتے۔"

"تو کیا ہمیں واپس چٹاگانگ جانا پڑے گا۔؟"

وہ کہنے لگا:۔ "ابھی اتنی جلدی ہمیں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ کاکسز بازار پہنچ کر حالات کا جائزہ لیں گے۔ اور میں اپنے دوست سے بھی مشورہ کروں گا۔"

پھر اس نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا:۔ "تم فکر کیوں کرتے ہو۔ خدا نے چاہا تو تمہیں اس مصیبت سے ضرور نکال دوں گا۔ بے فکر رہو۔"

رات ہم نے اس جنگل میں الاؤ کے پاس کچھ دیر باتیں کرتے اور کچھ دیر سو کر گذاری۔ رات کے پچھلے پہر بھی ہمیں دور سے دھماکوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ اس وقت محمود الحق اور میں جاگ رہے تھے۔ میں نے اس کی توجہ دھماکوں کی طرف دلائی تو وہ غور سے ان آوازوں کو سننے لگا جو تھوڑی دیر تک آتی رہیں۔ پھر خاموش ہو گئیں۔ اس نے کہا:۔

"یہ فوجی توپوں کی آواز تھی۔ ضرور اس طرف جنگلوں میں کہیں لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ پاک فوج کے جوان ہوں گے۔ وہ دشمن سے لڑ رہے ہوں گے۔"

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی کہ ہم آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے وقت ہم کاکسز بازار پہنچ گئے۔ یہاں محمود الحق کا دوست رہتا تھا۔ اس کا نام عبد الرحمان تھا۔ محمود ویگن سیدھی اس کے مکان پر لے گیا جو کاکسز بازار شہر کے تھوڑا باہر ایک سمندری کھاڑی کے کنارے پر تھا۔ یہ لکڑی کا ڈھلانی چھت والا مکان تھا۔ رحمان کو محمود کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ ہمیں بڑی گرم جوشی سے ملا۔

جمیلہ کو اس نے اندر اپنی بیوی کے پاس بھیج دیا۔ سفر کی وجہ سے میں بھی سخت تھک گیا تھا۔ رحمان کی بیوی نے پہلے سے مچھلی کا شوربہ اور چاول تیار کر رکھے تھے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ محمود نے مجھے کہا:۔

"تم کچھ دیر آرام کر لو۔ میں رحمان سے معاملات پر گفتگو کرتا ہوں اور ہم شہر جا کر حالات بھی معلوم کرتے ہیں۔ یہاں مکتی باہنی شاید نہ ہو مگر انڈین فوجی ضرور موجود ہوں گے۔ تمہیں ان سے بھی بچنا ہے، تم یہاں سے کسی طرف مت نکل جانا۔ مکان پر ہی رہنا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مکان کے برآمدے میں ایک طرف ناریل کی صف بچھی ہوئی تھی۔ میں اس پر جاکر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی۔ میں تھوڑی دیر ہی سویا تھا کہ محمود الحق نے آکر مجھے جگادیا۔ کہنے لگا:۔ "جلدی اٹھو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ میں نے دیکھا کہ جمیلہ بھی رحمان کی بیوی کے ساتھ دروازہ بند کئے کھڑی تھی۔ میں نے محمود سے پوچھا:۔ "کیا ہوا؟"

وہ بولا:۔ "خاموش رہو۔ ابھی بتاتا ہوں۔"

اتنے میں محمود کا دوست اور ہمارا نیا میزبان رحمان بھی اندر آگیا۔ کہنے لگا:۔

"پچھلے دروازے سے۔۔۔ پچھلے دروازے سے۔۔"

میں محمود الحق اور جمیلہ تیزی سے رحمان کے پیچھے پیچھے چلے۔ مکان کے پیچھے ایک دروازہ تھا جو عقبی گلی میں کھلتا تھا۔ یہاں پہلے سے ہماری ویگن موجود تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ رحمان نے محمود سے کہا:۔

"تم وہاں پہنچو۔ میں شام کو آؤں گا۔ جلدی کرو۔ یہاں سے نکل جاؤ۔"

محمود الحق نے ویگن سٹارٹ کی اور تیزی کے ساتھ گلی میں سے نکل گیا۔

میں اور جمیلہ آمنے سامنے کی سیٹوں پر گھبرائے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہاں کیا صورت حال بن گئی تھی۔ اس بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا مگر اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ معاملہ خراب ہے اور شہر میں یا تو مکتی باہنی والے آگئے ہیں یا انڈین ملٹری آگئی ہے۔ کاکسز بازار میں آبادی زیادہ نہیں تھی۔ ویگن پہاڑی ٹیلوں میں سے گذر رہی تھی۔ محمود الحق ویگن کو بڑی ہوشیاری سے ادھر ادھر موڑتا لئے جارہا تھا۔ ہم ایک ندی کے پل پر سے گذر کر دوسری جانب آئے تو محمود نے ویگن گھماکر ایک ٹیلے کے ساتھ کھڑی کردی اور کھڑکی میں سے منہ ہماری طرف کرکے بولا:۔

"شہر میں چاروں طرف انڈین ملٹری پھر رہی ہے۔ کہتے ہیں پاکستانی فوج کے کچھ کمانڈو جوان ایمونیشن کے ذخیروں کو آگ لگاکر ادھر آگئے ہیں۔ انڈین ملٹری ان کی تلاش میں گھر گھر تلاشی لے رہی ہے۔۔۔۔۔۔"

میں نے کہا:۔ "کیا یہاں ہم محفوظ ہیں؟"

مجھے اصل میں اپنی اتنی فکر نہیں تھا جتنی پریشانی جمیلہ کے لئے تھی۔ اس کی حفاظت میری ذمے داری بن گئی تھی۔ محمود ڈرائیونگ سیٹ پر سے اتر کر پیچھے ہمارے پاس آگیا۔ کہنے لگا:۔

"یہ جگہ کم از کم شہر سے ضرور محفوظ ہے' ہمیں اندھیرا ہونے تک اسی جگہ چھپے رہنا ہوگا۔"

جمیلہ اپنی سیٹ پر سر جھکائے پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ میں نے اور محمود الحق نے اسے حوصلہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ محمود بتانے لگا:۔

"ہم شہر میں گئے تو جگہ جگہ انڈین ملٹری کے سپاہیوں کو دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور یہاں کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ ہم ذرا آگے گئے تو چوک میں چند فوجی کھڑے تھے۔ ان میں ایک سکھ بھی تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا اور ہم سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ رحمان چونکہ کاکسز بازار کا رہنے والا ہے۔ اس نے دو تین جواب دے کر فوجی کی تسلی کردی۔ مگر ہمیں ان فوجیوں کے تیور سے اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی سنگین بات ہوئی ہے۔ رحمان اپنے ایک واقف دوکاندار کے پاس گیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ پاکستانی فوج کے بعض مورچوں میں ابھی تک جوان دشمن کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں اور یہ بھی کہ پاک فوج کے کمانڈوز انڈین ملٹری ایمونیشن کے ڈپو کو دھماکے سے اڑاکر اس طرف آئے ہیں۔ بھارتی فوجی ان کو تلاش کررہے ہیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ بازار میں دو تین گھروں کی تلاشی لی جارہی تھی اور فوجی کچھ بنگالیوں کو پکڑ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی لے جا رہے تھے۔ ہم وہیں سے واپس آ گئے۔ رحمان نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ یہاں آ کر چھپ جائیں۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ چنانچہ میں تم لوگوں کو لے کر یہاں آ گیا ہوں۔"

یہ ایک نئی مشکل آن پڑی تھی۔ لیکن ہمیں اس مشکل کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔ ہم وہیں درختوں میں ویگن کے اندر بیٹھے رہے۔ شام کا اندھیرا چھانے لگا تو رحمان آ گیا۔ کہنے لگا:۔

"تین بھارتی فوجی ہمارے مکان کی تلاشی لینے آئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں تم لوگوں کو یہاں بھیج چکا تھا' ورنہ ہم سارے اس وقت بھارتی فوج کی قید میں ہوتے۔ وہ لوگ مکان کے کمروں میں ادھر ادھر جھانک کر واپس چلے گئے۔ میں نے ایک سکھ فوجی سے معاملے کی نوعیت معلوم کرنا چاہی مگر اس نے مجھے ڈانٹ کر پیچھے دھکیل دیا۔"

میں نے رحمان سے کہا:۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس طرف سے آگے برما کی سرحد کی طرف نکل جائیں؟"

رحمان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:۔ "اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ میری اطلاع کے مطابق کاکسز بازار کے سارے سرحدی جنگلوں میں انڈین فوج پھیلی ہوئی ہے۔ تم کسی بھی جگہ پکڑے جا سکتے ہو۔"

"تو کیا ہم اسی جگہ پڑے رہیں گے؟"

یہ بات جمیلہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھی تھی۔ رحمان نے جمیلہ کو ایک نظر دیکھا۔ پھر محمود الحق کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:۔

"میرا خیال ہے ان لوگوں کے لئے میری وہی تجویز بہتر ہے گی جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

میں نے محمود الحق سے پوچھا:۔ "کونسی تجویز؟"

رحمان نے جواب میں کہا:۔ "میں جو کچھ تمہیں بتانے لگا ہوں' اسے غور سے سننا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے بارے میں جو پروگرام میں نے سوچا ہے' اس سے بہتر پروگرام دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ انڈین ملٹری نے اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے۔ انہیں جہاں کہیں کوئی بہاری' پٹھان یا پنجابی نظر آتا ہے' وہ اسے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے تم لوگ یہاں زیادہ دیر تک چھپے نہیں رہ سکتے۔ میں تمہیں واپس اپنے مکان پر بھی نہیں لے جا سکتا۔ میری تجویز یہ ہے کہ کہ تم لوگ برما کی طرف جانے کی بجائے جہاں پہنچنا اس وقت تقریباً ناممکن ہے' کلکتے پہنچ جاؤ۔۔۔"

میں اور جمیلہ اسکا منہ تکنے لگے۔ وہ ہمیں ایک دشمن کے چنگل سے نکل کر دوسرے دشمن کے چنگل میں جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ میں کچھ کہنے لگا تو رحمان بولا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ مگر میں ایک بات ضرور کہوں گا اور تمہارا ہمدرد بن کر کہہ رہا ہوں کہ یہاں کی نسبت تم کلکتے میں زیادہ محفوظ ہو گے۔ وہاں نہ کوئی مکتی باہنی ہو گا اور نہ ہی تمہیں پنجابی ہونے کی حیثیت سے پولیس والا یا فوجی ہی گرفتار کرے گا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن کلکتے سے ہم پاکستان کیسے جا سکیں گے۔ ان حالات میں جبکہ سرحدوں پر دونوں طرف کی فوجوں نے مورچے سنبھال رکھے ہیں ہم بارڈر کیسے کراس کریں گے؟"

رحمان نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کم از کم وہاں تم لوگوں کی جان ضرور بچ جائے گی۔ بنگلہ دیش سے بھاگ کر ہزاروں پنجابی اور بہاری انڈیا چلے گئے ہیں۔ وہاں اگر وہ لوگ پکڑے بھی گئے ہیں تو انہیں قید میں ہی ڈالا جائے گا کوئی مکتی باہنی والا انہیں قتل نہیں کرے گا۔"

میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"مگر کلکتے میں ہمارا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ہم وہاں کس کے پاس جائیں گے۔ میں اکیلا ہوتا تو اور بات تھی۔ مگر میرے ساتھ جمیلہ بہن بھی ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر انڈیا کے شہروں میں مارا مارا نہیں پھر سکتا۔"

اس وقت اچانک مجھے شاہد بٹ اور فیاض کے کزن خواجہ قمر کا خیال آ گیا جو دور پار سے ہمارا بھی کزن تھا اور ایک مدت سے کلکتے میں گرم شالوں کا چھوٹا موٹا کاروبار کر رہا تھا۔ مگر میں نے رحمان اور محمود کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ محمود الحق بولا۔

"رحمان بھائی! کلکتے میں تمہارا کوئی جاننے والا ایسا مسلمان نہیں ہے جہاں ان کو پناہ مل سکے؟"

رحمان سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"کلکتے میں میرا ایسا کوئی بھروسے والا آدمی نہیں ہے۔ لیکن کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں مسلمانوں کی بھاری تعداد آباد ہے۔ ان میں پنجابی بھی بہت ہیں۔ ان لوگوں کی زیادہ تر دکانیں ذکریا سٹریٹ میں ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر یہ ان میں سے کسی کے پاس جائیں گے تو وہ انہیں ضرور اپنی پناہ میں لے لیں گے۔ اس کے بعد آخر حالات ایک دن تو درست ہونے ہی ہیں۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانے بھی پھر سے کام کرنا شروع کر دیں گے۔ کلکتے کا پاکستانی سفارت خانہ پھر سے کھل جائے گا۔ یہ لوگ وہاں بڑی آسانی

سے پناہ حاصل کر سکیں گے۔ اور پاکستانی سفارت خانے کی مدد سے نئے پاسپورٹ بنوا کر پاکستان پہنچ جائیں گے۔"

میں الجھن میں پھنس گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ مجھے وہاں سے جمیلہ کو لے کر بھارت کی سرحد پار کرنی پڑے گی۔ کیونکہ کاکسز بازار کے جو حالات انہوں نے بتائے تھے وہ ہمارے لئے مہلک بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ جہاں تک محمود الحق اور اس کے دوست رحمان کی نیت کا تعلق تھا میں ان پر شک ہی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ محمود بڑی آسانی سے ہمیں رحمان کے حوالے کر کے جا سکتا تھا اور رحمان ہمیں جنگلوں میں برما کی سرحد کے قریب کہیں چھوڑ کر چلا جاتا۔ میں نے رحمان سے بڑا اہم سوال کیا۔ میں نے کہا۔

"لیکن ہم کلکتے کیسے پہنچ سکیں گے؟"

رحمان کہنے لگا۔

"اگر محمود تمہیں لے کر میرے پاس نہ آیا ہوتا تو اس سوال کا جواب یہی تھا کہ آپ لوگ کلکتے کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ خلیج بنگال میں چاروں طرف انڈین نیوی کے جنگی جہاز کھڑے ہیں۔ آپ کشتی میں سوار ہو کر ساحل کے ساتھ ساتھ بھی کلکتے نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ یہ کافی لمبا سمندری سفر ہے۔ لیکن یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم میرے پاس آ گئے ہو اور زیادہ خوش قسمتی یہ ہے کہ کاکسز کی بندرگاہ پر فلپائن کا ایک تیل بردار ٹینکر انڈیا جانے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ یہ ٹینکر انڈیا اور فلپائن کی بندرگاہوں کے درمیان اکثر آتا جاتا ہے۔ چونکہ میرا کاروبار بھی ایسا ہے کہ مجھے دن میں ایک دو بار بندرگاہ جانا پڑتا ہے۔ اس طرح فلپائن کے تیل بردار جہاز کا ایک فسٹ میٹ میرا دوست بن گیا ہے۔ جب بھی یہ تیل بردار جہاز یہاں لنگر انداز ہوتا ہے میرا فلپائنو دوست جس کا نام ہوزے ریٹو ہے مجھ سے ضرور ملتا ہے۔ اگر میں بندرگاہ پر نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتا تو وہ میرے مکان پر آجاتا ہے۔ یوں ہماری آپس میں بڑی گہری دوستی ہو گئی ہوئی ہے۔ تمہیں کلکتے پہنچانے میں میرا دوست ھنویٹو اہم رول ادا کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ہمارے پاس تو کوئی پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔"

رحمان بولا۔

"پاسپورٹ ہوتے بھی تو تم انڈیا نہیں جاسکتے تھے۔ اس وقت دونوں ملکوں میں جنگ کی صورت حال ہے۔ میرا فلاھنو دوست ھنویٹو اس سلسلے میں مجھے کوئی مشورہ دے سکتا ہے۔ پہلے میں اس سے بات کر لوں۔ ٹینکر ابھی تک کاکسز بازار کی بندرگاہ پر ہی کھڑا ہے۔ تمہارے آنے سے ایک دو دن پہلے ھنویٹو میرے گھر مجھ سے ملنے آیا تھا اس نے کھانا بھی میرے ساتھ کھایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی ہمیں سمندری سفر کی کلیرنس نہیں مل رہی۔ مگر چونکہ انڈیا کو تیل کی اس وقت اشد ضرورت ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ دو تین دن کے اندر اندر ہمیں راہداری مل جائے گی۔"

محمود الحق کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے اگر یہ انتظام ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو گا۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"کلکتے پہنچ کر تم لوگ گھبرا تو نہیں جاؤ گے؟ وہ بہت بڑا شہر ہے۔ بڑا شہر ہونے کا تمہیں ایک یہ بھی فائدہ ہو گا کہ تمہاری طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔۔۔"

تب میں نے انہیں انڈیا والے اپنے ذکریا سٹریٹ والے رشتے دار خواجہ قمر کے بارے میں بتا دیا۔ رحمان اور محمود الحق بڑے خوش ہوئے۔ محمود نے کہا۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ کیا تم پہلے بھی کلکتے گئے ہو؟ اگر نہیں بھی گئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم کلکتے کی بندرگاہ سے کسی بھی رکشے یا ٹیکسی میں سوار ہو کر ذکریا سٹریٹ جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں پہلے کلکتے صرف ایک بار گیا ہوں۔ مگر یہ چھ سات سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن میں ذکریا سٹریٹ پہنچ جاؤں گا۔"

رحمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے سیدھا بندرگاہ پر جاؤں گا۔ ھنویٹو جہاز پر مجھے مل جائے گا۔ مجھے بندرگاہ آتے جاتے کوئی نہیں روکتا۔ اجازت نامہ ہمیشہ میری جیب میں ہوتا ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ تم لوگوں کو رات اسی جگہ ویگن میں گزارنی ہوگی۔ میں کل صبح آؤں گا۔ کیوں محمود تمہارا کیا خیال ہے؟۔"

وہ بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ انہیں واپس میرے مکان پر نہیں جانا چاہیے۔ میں رات کو ان کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں صبح آؤں گا۔"

رحمان چلا گیا۔ رات ہم نے کسی نہ کسی طرح جنگل میں اپنی ویگن میں ہی گزار دی۔ اگلے روز کافی دن نکل آیا کہ رحمان درختوں میں سے آتا نظر آیا۔ وہ ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

"میں نے ھنویٹو سے ساری بات طے کر لی ہے۔ اگرچہ یہ بڑا مشکل اور تقریباً ناممکن کام ہے لیکن میرے دوست نے میری خاطر ایک طریقہ نکال لیا ہے۔ وہ جہاز کے کپتان کو اعتماد میں لئے بغیر یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس نے کہا ہے کہ آج

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہاز کے کپتان سے بات کروں گا اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر تم دونوں کو بنگلہ دیش سے بھارت پہنچانے کے لئے کپتان کو راضی کر لوں گا۔ اب آخری بات شام کو معلوم ہوگی کہ جہاز کے کپتان نے کیا فیصلہ کیا ہے"۔

رحمان تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا محمود ہمارے پاس ہی رہا۔ وہ ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ دوپہر کو وہ ضرور تھوڑی دیر کے لئے ویگن لے کر شہر گیا اور ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان لے آیا۔ ہم وہیں پڑے رہے۔ جمیلہ اب نہ پریشان تھی' نہ خوش تھی۔ وہ جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ سب کچھ دیکھتی' سب کچھ سنتی اور خاموش رہتی۔

شام ہونے سے ذرا پہلے رحمان دوبارہ آیا تو وہ خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی کہنے لگا:۔

"مبارک ہو۔ جہاز کا کپتان تم لوگوں کو کلکتے لے جانے پر راضی ہو گیا ہے۔ میرے دوست ہوہنو یٹو نے انسانی ہمدردی کی بنا پر کپتان کو راضی کیا ہے۔ اب ایسا ہے کہ تم لوگ یہیں سے رات کے بارہ بجے بندر گاہ کی طرف جاؤ گے۔ میں گیارہ بجے تمہارے پاس اسی جگہ پہنچ جاؤں گا۔ بندر گاہ پر میرا دوست ہیزیٹو وہاں موجود ہو گا۔ بس میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ رات کے گیارہ بجے وہ واپس آیا اور ہم لوگ ویگن میں سوار ہو کر بندر گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دفعہ رحمان خود ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ ہمیں غیر آباد راستوں سے لے کر بندر گاہ پر ایک ایسے مقام پر آ گیا جہاں ہمیں رات کے اندھیرے میں ایک بہت بڑے جہاز کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جو کافی فاصلے پر سمندر میں کھڑا تھا۔ ویگن ایک بہت بڑے گودام کے پاس سمندر کی کھاڑی کے کنارے کھڑی تھی۔ رحمان باہر نکل آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں ایک طرف

اندھیرے میں سے ایک انسانی ہیولہ ہماری طرف بڑھا۔ اس انسان کا قد بنگالیوں کی طرح چھوٹا تھا۔ رحمان نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور ویگن میں لے آیا۔ یہ چھوٹے قد کا زرد رنگ کا نوجوان ہیزیٹو تھا۔ رحمان نے اسکا تعارف کروایا۔ ہوہنو یٹو نے کہا:۔

"سب معاملہ ٹھیک ہے۔ کم از کم ابھی تک ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آجاؤ"۔

محمود الحق ویگن میں ہی رہا۔ میں رحمان اور جمیلہ' فلاہہنو فرسٹ میٹ ہیزیٹو کے ساتھ اندھیرے میں کھاڑی کے کنارے کنارے ایک طرف روانہ ہو گئے۔ جانے سے پہلے میں نے محمود الحق سے ہاتھ ملایا۔ اس کا اور فاطمہ بہن اور نگینہ بہن کا بھی شکریہ ادا کیا۔ محمود الحق کہنے لگا:۔

"اللہ کرے کہ تم لوگ خیریت سے پاکستان پہنچ جاؤ۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

ہیزیٹو ہمیں لے کر کھاڑی میں ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں ایک کشتی کھڑی تھی۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ ہیزیٹو نے چپو تھام لئے اور کشتی کو کھاڑی سے نکال کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے ارد گرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بحری جہاز کھڑے تھے۔ ایک موٹر بوٹ دور سے گزر گئی۔ ہماری کشتی آئل ٹینکر کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ہم سب خاموش بیٹھے تھے۔ صرف چپو چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ تیل بردار جہاز اور قریب آ گیا۔ یہ بہت بڑا جہاز تھا۔ اس کی لمبائی کافی زیادہ تھی۔ ڈیک پر جگہ جگہ لوہے کی کرینوں کے اوپر کو اٹھے ہوئے گارڈر نظر آ رہے تھے۔ ہیزیٹو کشتی کو جہاز کے عقب میں لے آیا۔ یہاں جہاز کے سٹار بورڈ کے ساتھ لوہے کی ایک کشتی چمٹی ہوئی تھی۔ ہیزیٹو نے کشتی کی رسی لوہے کی سیڑھی میں پھنسائی اور آہستہ سے بولا:۔

"پہلے لیڈی کو اوپر جانا ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جمیلہ ڈری ہوئی تھی۔ ہمارے دونوں جانب بڑا گہرا بلکہ سیاہ رنگ کا سمندر ہی سمندر تھا۔ میں نے جمیلہ کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ بولی:۔

"میں چڑھ جاؤں گی۔"

انسان پر جب مصیبت کی گھڑی آتی ہے تو جہاں وہ پریشان ہوتا ہے' وہاں اس کی بعض خوابیدہ توانائیاں بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔ جمیلہ کو ہیزیٹو نے سہارا دے کر لوہے کی سیڑھی پر چڑھا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہیزیٹو نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اوپر ڈیک پر پہنچنے کے بعد وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد میری باری تھی۔ میں نے رحمان سے ہاتھ ملایا۔ اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور میں بھی سیڑھی چڑھ گیا۔ اوپر ڈیک دور دور تک بالکل خالی تھا۔ جمیلہ وہیں جنگلے کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ رحمان خالی کشتی کو واپس لے کر جا رہا تھا اور اس کا دوست ہونریٹو سیڑھی چڑھتا ہوا تیزی سے اوپر آ رہا تھا۔ اوپر آ کر وہ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ زیادہ تر انگریزی میں بات کرتا تھا۔ کہنے لگا:۔

"تم لوگ ابھی یہیں بیٹھے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہاں سے مت ہلنا"۔

وہ چلا گیا۔ جہاز کا ڈیک خالی تھا۔ کہیں کہیں کرین پر چھوٹے چھوٹے سرخ اور سنہری رنگ کے بلب روشن تھے۔ جس طرف ہم بیٹھے تھے' وہاں جہاز کی تین منزلہ عمارت تھی۔ آگے ڈیک دور تک چلا گیا تھا۔ جمیلہ نے آہستہ سے کہا: "بھائی جان! کیا ہم کلکتے پہنچ جائیں گے؟"

میں نے اسے تسلی دی:۔

"کیوں نہیں۔ انشاءاللہ ہم ضرور پہنچ جائیں گے۔"

"ہم وہاں تو نہیں پکڑے جائیں گے؟"

"ایسی باتیں مت سوچو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

ایک موٹر بوٹ جہاز کی دوسری جانب سے شور مچاتی گذر گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہونریٹو آیا اور کہنے لگا:۔

"تم ایک ایک کر کے میرے ساتھ جاؤ گے۔"

پہلے جمیلہ کو اس نے ساتھ لیا اور ڈیک پر جو عمارت بنی ہوئی تھی' اس کے عقب کی طرف چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ہونریٹو آیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جہاز کی عمارت پر بڑے بڑے کیبن بنے ہوئے تھے جن میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ ہم جہاز کی گول دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں اندھیرا بھی تھا۔ ایک جگہ زینہ نیچے جاتا تھا۔ ہم زینہ اتر گئے۔ نیچے ایک تنگ راہ داری تھی۔ یہاں مدھم روشنی تھی۔ کونے میں ایک کیبن کا دروازہ تھا۔ ہیزیٹو اور میں اسی کیبن میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ کیبن میں لوہے اور لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا تھا۔ ایک طرف فرش پر جمیلہ سہمی بیٹھی تھی۔

ہیزیٹو نے مجھے انگریزی میں کہا:۔

"اس کیبن میں کوئی نہیں آتا۔ سامنے والا میرا کیبن ہے۔ تم لوگ اس کیبن میں اس وقت تک چھپے رہو گے جب تک کلکتے کی بندرگاہ نہیں آ جاتی۔ میں تمہارا خیال رکھوں گا اور تمہیں کھانے پینے کو پہنچاتا رہوں گا۔"

پھر وہ اپنے کیبن میں گیا اور وہاں سے دو چادریں اور دو تکئے لے آیا۔

"تمہیں فرش پر ہی رات کو لیٹنا ہو گا۔ اگرچہ میں نے کپتان سے ساری بات طے کر لی ہوئی ہے اور کپتان کی اجازت سے ہی تم یہاں تک پہنچ سکے ہو لیکن کپتان نہیں چاہتا کہ جہاز پر کسی دوسرے کو تمہارے بارے میں علم ہو۔ اس معاملے میں بڑی راز داری رکھنی ہو گی۔ اب تم آرام کرو۔ میں صبح تمہارے لئے چائے وغیرہ لے کر آؤں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گا۔ باتھ روم تمہارے کیبن کے بالکل ساتھ ہی ہے۔ بے فکر رہو۔ اس باتھ روم کی طرف بھی کوئی نہیں آتا۔ اس راہ داری میں صرف یہی دو کیبن ہیں۔ ایک کیبن سٹور روم ہے جس میں تم بیٹھے ہو اور دوسرا سامنے والا میرا کیبن ہے۔ اگر کوئی ضرورت پڑ جائے تو میرے کیبن پر دستک دے کر مجھے جگا سکتے ہو۔ لیکن بے حد احتیاط سے دستک دینا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے تمہاری آواز اوپر والے کیبن میں پہنچ جائے۔ اوپر والے کیبن جہاز کے دوسرے میٹ ملازموں کے ہیں۔ او کے۔ گڈ نائٹ۔"

ھینڈریو چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کیبن کا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ کیبن اگرچہ چاروں طرف سے بند تھا مگر اوپر ایک جانب ایک گول سوراخ تھا جس میں سے باہر کی تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ ھینڈریو نے بتایا تھا کہ جہاز صبح صبح روانہ ہو گا۔ نیند نہ مجھے آ رہی تھی نہ جمیلہ کو۔ لیکن میں نے جگہ صاف کر کے جمیلہ کے لئے چادر بچھا دی تھی۔ کچھ دیر تک وہ مایوسی کے انداز میں باتیں کرتی رہی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ کبھی اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ سکے گی۔ اگرچہ میں اسے حوصلہ دلاتا رہا مگر وہ بہت ناامید تھی۔

میرے کہنے پر وہ لیٹ گئی۔ چادر اس نے اوپر کر لی۔ میں بھی دوسری طرف دیوار کے ساتھ منہ کر کے لیٹ گیا۔ نیند مجھ سے بھی کوسوں دور تھی۔ ہوا اندر ضرور آ رہی تھی۔ مگر بند کیبن میں گھٹن کا احساس بھی تھا۔ وقت گذرتا جا رہا تھا۔ سوتے جاگتے نہ جانے کتنی رات گذر گئی ہو گی کہ جہاز کے فرش میں ہلکی ہلکی لرزش سی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ باہر سے دو تین بار ایسی آوازیں آئیں جیسے جہاز کا سائرن بج رہا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز آنے لگی تھی۔ جہاز کے فرش کی لرزش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر جیسے ہلکا سا دھچکا لگا اور جہاز نامعلوم انداز میں دائیں بائیں ڈولنے لگا۔ جہاز چل پڑا تھا۔ یہ بات میرے لئے اگرچہ اطمینان کا باعث تھی کہ میں کم از کم بنگلہ

دیش کے بوچڑ خانے سے جان بچا کر نکل رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ پریشانی بھی لگی ہوئی تھی کہ میں یہاں سے نکل کر پاکستان نہیں جا رہا بلکہ ہندوستان جا رہا ہوں جو ہمارا دشمن ملک ہے۔

شاہد اور فیاض نے ڈھاکہ میں میرے قیام کے دوران زکریا سٹریٹ میں خواجہ قمر کا پتہ مجھے لکھوا دیا تھا جو وہیں رہ گیا تھا مگر مجھے اس کے مکان کا نمبر زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میں نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ کئے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا اس بے چاری کے ماں باپ اس کے لئے نہ جانے کس قدر پریشان ہوں گے۔ اگر کسی طرح انہیں صرف اتنا ہی معلوم ہو جائے کہ ان کی بیٹی کی عزت محفوظ ہے اور وہ بنگلہ دیش سے عزت اور جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے تو ان کی آدھی پریشانی دور ہو جائے۔ یہ تیل بردار جہاز انجن کی ایک مخصوص آواز کے ساتھ دائیں بائیں نامعلوم انداز میں سمندر میں چلا جا رہا تھا۔ اتنے میں جمیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پوچھا۔

"جہاز ہل کیوں رہا ہے؟؟"

میں نے کہا:۔ "ہم کلکتہ کی طرف جا رہے ہیں۔"

وہ اٹھ بیٹھی اور بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بولی:۔

"کیا ہم بنگلہ دیش سے نکل آئے ہیں؟؟"

"ہاں جمیلہ بہن۔ ہم اس جہنم سے نکل آئے ہیں۔"

جمیلہ نے مایوسی کے لہجے میں کہا:۔ "کاش یہ جہاز کراچی جا رہا ہوتا۔۔۔"

میں نے کہا:۔ "انشاء اللہ ہم کراچی بھی پہنچ جائیں گے۔ حوصلہ رکھو۔ جس اللہ نے ہمیں یہاں سے بچا لیا ہے، وہی ہمیں پاکستان بھی پہنچا دے گا۔"

وہ پوچھنے لگی:۔ "ہم کب کلکتہ پہنچیں گے؟؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے کہا۔ "ہینڈریٹو نے بتایا تھا کہ چونکہ تیل بردار جہاز کی سپیڈ زیادہ نہیں ہوتی اور جہاز کھلے سمندر میں سفر کرنے کی بجائے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرے گا۔ اس لئے تین دن لگ جائیں گے۔"

چھت کے کونے والے جس سوراخ میں سے تازہ ہوا کیبن میں آرہی تھی اسی میں سے تھوڑی تھوڑی روشنی بھی آرہی تھی' شاید یہ کسی پائپ کا نچلا سرا تھا جس کا اوپر والا حصہ جہاز کے ڈیک پر کسی طرف نکلا ہوا تھا اور اس کے اوپر بجلی کا کوئی بلب روشن تھا۔ میں نے جمیلہ سے کہا:

"میرا خیال ہے ہمیں تھوڑی دیر مزید سو جانا چاہئے کیونکہ ابھی رات کافی باقی ہے۔"

جمیلہ لیٹ گئی۔ میں بھی دیوار کے ساتھ منہ کر کے لیٹ گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کیبن کی دیوار کے ساتھ جلنے والا بجلی کا چھوٹا سا بلب اپنے آپ بجھ چکا تھا۔ چھت کے پائپ کے سوراخ میں سے دھندلی دھندلی سفید روشنی اندر آرہی تھی۔ جمیلہ بھی جاگ پڑی۔ اس نے پوچھا: "کیا صبح ہوگئی ہے؟"

میں نے پائپ کے سوراخ کی طرف اشارہ کر کے کہا: "میرا خیال ہے باہر دن نکل آیا ہے۔ یہ روشنی مجھے دھوپ کی لگتی ہے۔"

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے دروازے کا تالا کسی نے کھول کر دروازے پر ٹھک ٹھک کی۔ ساتھ ہی ہینڈریٹو کی آواز آئی:

"یہ میں ہوں ہینڈریٹو۔"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ہینڈریٹو اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور ایک لفافہ تھا۔ وہ ہمارے لئے ناشتہ لایا تھا۔ جمیلہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

"خاتون! تم باتھ روم جاکر منہ ہاتھ دھولو۔ اس کے بعد تمہارا بھائی جاکر منہ ہاتھ دھو آئے گا۔ یاد رکھنا' باتھ یہاں سے آگے کونے میں ہے' باہر باتھ روم لکھا ہوا ہے۔"

جمیلہ باہر نکل گئی۔ میں نے ہینڈریٹو سے کہا:

"راستے میں جہاز کی چیکنگ کا کوئی خطرہ تو نہیں....؟"

اس نے میرے مگ میں چائے ڈالتے ہوئے کہا:

"چیکنگ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جنگ بندی ہو چکی ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی خطرہ ہوتا تو ہمیں کاکسز بازار ہی سے نکلنے کی اجازت نہ ملتی۔ ہم تیسرے دن کلکتہ کی خضر پور جیٹی پر ہوں گے۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ جمیلہ منہ ہاتھ دھو کر آگئی۔ اس کے بعد میں باتھ روم میں منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ واپس آکر ہم تینوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ چائے پی۔ ہینڈریٹو نے کہا:

"اس وقت دن کے نو بج رہے ہیں۔ جہاز ایک گھنٹے بعد ذرا متلاطم سمندر میں داخل ہوگا۔ اس کی رولنگ بڑھ جائے گی۔ تمہیں چکر تو نہیں آئیں گے۔۔۔؟"

میں نے کہا: "مجھے تو نہیں آئیں گے' جمیلہ بہن سے پوچھ لیتے ہیں۔"

جمیلہ کہنے لگی: "میرا خیال ہے مجھے بھی نہیں آئیں گے۔"

ہینڈریٹو نے کہا: "بہرحال میں تم لوگوں کو دو چار ٹیبلٹ لا دوں گا۔ اگر چکر زیادہ آنے لگیں تو ایک گولی منہ میں ڈال کر چوستے رہنا۔ چکر غائب ہو جائیں گے۔"

ہینڈریٹو چلا گیا۔ ہم دونوں کیبن میں ہی بیٹھے رہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جہاز کی رولنگ بڑھ گئی۔ جہاز متلاطم سمندر میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاز دائیں بائیں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آگے پیچھے ڈول رہا تھا۔ ہینریٹو ہمارے لئے ٹیبلٹ لے کر آگیا۔ کہنے لگا: ”یہ ایک ایک ٹیبلٹ منہ میں ڈال لو۔“

میں نے اور جمیلہ نے ایک ایک گولی منہ میں رکھ لی۔ اس وقت ہم دونوں کو واقعی چکر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ٹیبلٹ نے طلسماتی اثر دکھایا۔ چکر غائب ہو گئے۔ بعد میں ہینریٹو نے مجھے بتایا کہ ان گولیوں میں الکوحل تھی۔ اس طرح ایک دن' دو دن اور پھر تیسرا دن بھی سمندر میں سفر کرتے گذر گیا۔ تیسرے دن کی صبح کو ہینریٹو ہمارے لئے ناشتہ لے کر آیا تو کہنے لگا:

”ہم کلکتے پہنچنے والے ہیں۔ اگر تم اس وقت جہاز کے ڈیک پر ہوتے تو تمہیں دریا کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں نظر آتیں۔“

میں نے پوچھا: ”دریا....؟“

وہ بولا: ”کلکتے کی بندرگاہ سمندر کے کنارے پر نہیں بلکہ دریا کے دہانے پر واقع ہے۔ اس دریا کا نام ہگلی ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ اب جہاز بالکل نہیں ڈول رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اب سمندر میں نہیں بلکہ دریا میں سفر کر رہے ہیں۔“

جمیلہ نے کہا: ”ہم کتنی دیر بعد بندرگاہ پر پہنچیں گے۔“

ہینریٹو بولا: ”یہی کوئی تین گھنٹے لگ جائیں گے۔“

جمیلہ نے فکر مند ہو کر پوچھا: ”بندرگاہ پر ہمیں پولیس تو نہیں پکڑ لے گی؟“

ہینریٹو میری طرف دیکھنے لگا۔ بولا: ”مسٹر! میں بندرگاہ پر تمہارے ساتھ تو نہیں ہوں گا۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں تو تم لوگوں کو جہاز کے پچھلے مال گودام کی طرف سے باہر نکال دوں گا۔ پھر واپس آجاؤں گا۔“

جمیلہ نے اس کے بعد کوئی سوال نہ کیا۔ ہینریٹو ہمارے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے لگا تو بولا: ”اب میں اس وقت آؤں گا جب جہاز بندرگاہ پر رک چکا ہو گا۔“

اور وہ چلا گیا۔ کلکتہ قریب آرہا تھا اور جمیلہ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتی کہ بندرگاہ پر پولیس تو نہیں ہوگی۔ انڈیا کے فوجی تو نہیں ہوں گے۔ اسکی پریشانی درست تھی۔ یہ پریشانی مجھے بھی لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ مجھے یہی تسلی دی گئی تھی کہ بھارت میں ہم بنگلہ دیش کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہوں گے۔ وہاں مکتی باہنی والے نہیں ہوں گے۔ وہاں بھارتی فوجی بھی نہیں ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ معلوم نہیں تھا کہ کلکتے کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد ہم پر کیا گذرنے والی ہے----

آخر جہاز رک گیا۔ جہاز کو رکے کوئی دو گھنٹے گذر چکے تھے کہ ہینریٹو آگیا۔ کہنے لگا: ”آؤ' میرے ساتھ۔“

ہم دونوں پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ ہینریٹو ہمیں جہاز کے لوئر ڈیک میں سے گذار کر ایک دوسرے راستے سے جہاز کے پہلی منزل والے ڈیک پر لے آیا۔ یہاں بندرگاہ کا پلیٹ فارم جس کو وارف کہتے ہیں' بالکل ساتھ لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں ہینریٹو کی ہدایت کے مطابق اس کے بالکل ساتھ لگ کر چل رہے تھے۔ ایک طرف بہت بڑے بڑے کریٹ پڑے تھے۔ ہم ادھر سے ہو کر پلیٹ فارم کی دوسری جانب نکل آئے۔ یہاں ایک ریلوے لائن تھی جس پر مال گاڑی کے دو ڈبے کھڑے تھے۔

ہینریٹو ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ ہم مال گاڑی کے ڈبوں کے پیچھے سے ہو کر نکلے تو سامنے ایک جنگلہ تھا۔ جنگلہ کھلا تھا۔ وہاں ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ اس نے ہینریٹو کو دیکھ کر سلام کیا۔ ہینریٹو نے اسکا ٹوٹی پھوٹی بنگلہ زبان میں حال چال پوچھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ہم ایک بہت بڑے گودام کو اپنی دائیں جانب چھوڑتے ہوئے اس کے عقب میں آ گئے۔ یہاں ہمیں سامنے کچھ فاصلے پر ایک کشادہ سڑک دکھائی دی۔ سڑک کے کنارے دور دور تک اونچی اونچی بلڈنگیں تھیں۔ سڑک پر موٹر کاریں اور بسیں گذر رہی تھیں۔ اس وقت دھوپ ڈھل رہی تھی اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہینزیٹو رک گیا۔ اس نے کہا:

"یہاں پر میرا فرض ختم ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو تھوڑا آگے جاکر کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ اوکے۔ بائی۔"

اس نے ہمیں شکریہ ادا کرنے کا بھی موقع نہ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا جدھر سے ہمیں لے کر آیا تھا' اسی طرف چلا گیا۔ ہم اپنے محسن کو نم آنکھوں سے اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ ہماری نظروں سے غائب نہ ہو گیا۔

☆☆☆

جمیلہ میرے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

میں نے اسے کہا: "گھبرانا بالکل نہیں۔ اگرچہ ہم دشمن ملک میں ہیں مگر یہاں بنگلہ دیش والی بات نہیں ہے۔"

ہم آہستہ آہستہ چلتے فٹ پاتھ پر آ گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک خالی ٹیکسی آ کر ہمارے قریب رک گئی۔ ڈرائیور نے سر باہر نکال کر پوچھا: "بابو کہاں چلے گا۔"

میں نے کہا: "زکریا سٹریٹ جائے گا۔"

ڈرائیور بولا: "دس روپیہ لگے گا۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

میں اور جمیلہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی کلکتے کے بازاروں میں زکریا سٹریٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ ٹیکسی ایک بہت وسیع راؤنڈ اباؤٹ گھوم کر بندر گاہ کے مین گیٹ کے سامنے سے گذری تو وہاں مجھے انڈین ملٹری پولیس کے فوجی کھڑے اندر سے باہر نکلنے والے لوگوں کی چیکنگ کرتے دکھائی دیئے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہینزیٹو کی وجہ سے ہم مین گیٹ کی بجائے دوسری طرف سے بندر گاہ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باہر آئے تھے۔ کلکتہ کے بازاروں میں بھی ہر چوک میں فوجی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کے آدمی بھی تھے۔ وہ آنے جانے والی گاڑیوں کی چیکنگ تو نہیں کرتے تھے مگر اندر بیٹھے مسافروں کو گھور کر ضرور دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد وہاں سے بعض لوگ جانیں بچاکر کلکتے آگئے تھے۔ ان میں پاک فوج کے جوان بھی تھے۔

تقریباً ہر چوک میں سے گذرتے ہوئے بھارتی فوجی ہمیں بھی غور سے ضرور دیکھتے۔ لیکن چونکہ جمیلہ نے ساڑھی پہن رکھی تھی' اس لئے وہ ہمیں بنگالی ہی سمجھتے تھے۔ ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ ڈرائیور نے کہا: ”صاحب میں تھوڑا سگریٹ لے آؤں۔“

وہ گاڑی سے اتر کر سگریٹ پان والے کی دکان کی طرف گیا تو میں نے جمیلہ سے کہا: ”مجھے شک ہے کہیں یہ ٹیکسی ڈرائیور ہمیں غیر بنگالی نہ سمجھ رہا ہو۔ اس لئے تم مجھ سے ایک آدھ بات بنگالی زبان میں ضرور کرنا۔“

جمیلہ نے کہا: ”تم آگے سے کوئی جواب مت دینا کیونکہ تم بنگلہ نہیں جانتے۔ بس انگریزی میں اوکے' اوکے کہہ دینا۔“

اتنے میں ڈرائیور سگریٹ لے کر آگیا۔ ٹیکسی آگے روانہ ہوئی تو جمیلہ نے بنگلہ زبان میں مجھے کچھ کہا۔ میں نے ہنس کر آگے سے اوکے اوکے کہہ دیا۔ ٹیکسی ایک ایسے بازار میں داخل ہوئی جس کے درمیان میں ٹرام کار کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آگیا کہ زکریا سٹریٹ جاتے ہوئے لوئر چت پور روڈ آتی ہے' جہاں ٹرام کار چلتی ہے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں یہاں کا ہی رہنے والا ہوں' یہ بات کہی۔۔۔

”بس لوئر چت پور روڈ کے کونے پر ہمیں اتار دینا۔ ہمارا مکان وہیں ہے۔“

ٹیکسی ڈرائیور بولا:

”ٹھیک ہے صاحب۔“

ٹیکسی واقعی لوئر چت پور روڈ پر سے ہی گذر رہی تھی کیونکہ تھوڑی دور جاکر ڈرائیور نے ٹیکسی ایک طرف کھڑی کر دی۔ میں نے اسے کرایہ دیا اور جمیلہ کو ساتھ لے کر ایک طرف بازار میں گھوم گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ زکریا سٹریٹ کو وہاں سے کونسا راستہ جاتا ہے۔ اچانک میری نظر مسجد کے اونچے میناروں پر پڑی۔ مجھے یاد آگیا کہ زکریا سٹریٹ میں مسجد ناخدا بھی ہے۔ یہ اسی مسجد کے مینار ہیں۔ ڈر کے مارے میں کسی دوکاندار سے پوچھتا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس طرح میرے اجنبی ہونے کا راز کھل جاتا تھا اور کلکتے میں اس وقت ہر اجنبی آدمی کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی سویلین کپڑوں میں عام پھر رہے تھے۔

میں مسجد ناخدا کے بڑے دروازے پر آکر رک گیا۔ اندر سے ایک مسلمان نمازی باہر نکلا تو میں نے اس سے زکریا سٹریٹ کا پوچھا۔ وہ بولا:

”ساتھ والا بازار زکریا سٹریٹ ہی ہے۔“

زکریا سٹریٹ میں داخل ہوا تو ایسے لگا جیسے پاکستان کے کسی محلے میں آگیا ہوں۔ پشمینے کی دوکانوں پر امرتسر کے کشمیری مسلمان بیٹھے کاروبار کر رہے تھے۔ دو تین برقعہ پوش عورتیں بھی نظر آئیں۔ اب مجھے خواجہ قمر کی دکان کی تلاش تھی۔ مجھے اسکی دکان یاد نہیں تھی۔ میں نے شالوں کی دکان کے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے خواجہ قمر کو پوچھا تو وہ مجھے اوپر نیچے دیکھنے لگا۔ یہ آدمی گورے چٹے رنگ کا آدمی تھا۔ عمر ساٹھ سے اوپر ہوگی مگر صحت قابل رشک تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے کہا: "جی بس یہیں سے آئے ہیں۔ آپ پلیز ہمیں خواجہ قمر صاحب کے مکان کا پتہ بتا دیں۔"

حیرانی کی بات کہ میں خواجہ صاحب کے مکان کا نمبر بھول گیا تھا۔ حالانکہ کاکسز بازار سے روانہ ہوتے وقت نمبر مجھے یاد تھا۔ یہ محض میرے ذہن کی پریشانی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ آدمی بولا: "میں ہی خواجہ قمرالدین ہوں۔ مگر آپ لوگ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

میں ٹھٹھک سا گیا۔ کچھ شرمندہ بھی ہوا۔ میں نے کہا۔

"ذرا ایک طرف آجائیں۔ ہماری داستان بڑی لمبی ہے۔"

خواجہ صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"میرے ساتھ آجائیں۔"

ان کا مکان بازار کی ایک گلی میں تھا۔ ہمیں مکان کی بیٹھک میں لا کر انہوں نے بٹھایا اور نوکر سے چائے لانے کو کہا۔ میں اور جمیلہ خاموشی سے پرانے سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ خواجہ صاحب ہماری سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"فرمائیے۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

میں نے کہا: "خواجہ صاحب! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اس وقت پندرہ سولہ برس کا تھا جب میں نے آپ کو امرتسر میں دیکھا تھا۔ یہ بتائیں کہ آپ شاہد بٹ اور فیاض بٹ کو تو ضرور جانتے ہوں گے۔"

خواجہ صاحب چونک پڑے۔ "ہاں ہاں۔ وہ میرے بڑے قریبی عزیز ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ کیا وہ خیریت سے ہیں؟ مجھے ان کی بڑی فکر لگی ہے۔ کیا آپ بھی بنگلہ دیش سے آئے ہیں؟"

میں نے کہا: "میں ان کا کزن ہوں۔"

میں نے خواجہ صاحب کو اپنے بارے میں بتایا تو انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ جمیلہ کے بارے میں پوچھا۔

"یہ بیٹی کون ہے؟"

تب میں نے خواجہ صاحب کو شروع سے آخر تک سارے واقعات بیان کر دیے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے سنتے رہے۔ اسی دوران نوکر چائے اور مٹھائی رکھ کر چلا گیا تھا۔ جب میں نے اپنی داستان غم ختم کی تو خواجہ صاحب نے جمیلہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ کلکتے کے حالات پہلے ایسے نہیں ہیں۔ یہاں بھی سی آئی ڈی جگہ جگہ موجود ہے اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے پنجابیوں اور دوسرے غیر بنگالیوں کو پولیس پکڑ کر لے جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود یہاں امن ہے۔ لوگ مجھے جانتے ہیں۔ پولیس والے بھی جانتے ہیں۔ میں ایک مدت سے یہاں بزنس کر رہا ہوں۔ میری بیوی بالی گنج اپنی بڑی بہن سے ملنے گئی ہوئی ہے وہ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ تم یہاں بالکل اسی طرح رہنا جس طرح اپنے وزیر آباد والے گھر میں رہتی تھیں۔ انشاللہ تم دونوں کو پاکستان پہنچانے کے لئے مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گا۔"

جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خواجہ صاحب نے اسے اس طرح حوصلہ دیا جس طرح ایک باپ اپنی غم زدہ بیٹی کو حوصلہ دیتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے بھی محسوس ہوا جیسے میں پاکستان آگیا ہوں۔

خواجہ صاحب نے ہمیں چائے بنا کر دی۔ وہ کہنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جمیلہ بیٹی تو میرے گھر میں میری بیٹی بن کر رہے گی۔ اسے تو باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

پھر میری متوجہ ہو کر کہا۔

"لیکن بیٹا تم بھی میرے گھر سے زیادہ باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا تو اچھا ہے اسکی وجہ یہ ہے اس علاقے میں سی آئی ڈی سفید کپڑوں میں موجود ہے اور پولیس کے مخبر بھی موجود ہیں۔ ان میں سے کسی نہ کسی نے تم دونوں کو ضرور میرے ساتھ یہاں آتے دیکھ لیا ہو گا۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بازار میں ایسے دکانداروں کو جن کے پاس مخبر قسم کے لوگ آکر بیٹھتے ہیں میں بتا دوں گا کہ دلی سے میری بڑی بہن کا بیٹا اور بیٹی مجھ سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ لیکن اسکے باوجود میں تمہیں خاص طور پر ہدایت کروں گا کہ میں جب تک تم دونوں کو یہاں سے پاکستان پہنچانے کا انتظام نہیں کر لیتا تم اس مکان سے باہر نہ ہی نکلو تو اچھا ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کبھی دکان پر لے چلوں تو اور بات ہے۔ تم اکیلے باہر نہیں نکلو گے۔ ٹھیک ہے ناں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں خواجہ صاحب! آپ جیسا کہیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

ہم بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ خواجہ صاحب کی بیوی بھی آگئیں۔ ادھیڑ عمر مگر صحتمند گوری چٹی کشمیرن تھیں۔ مگر ساڑھی میں تھیں۔ خواجہ صاحب نے سب سے پہلے میرا تعارف کروایا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بڑا پیار کیا اور کہا۔

"ایک مدت ہوئی تم لوگوں کے ماں باپ کو دیکھے ہوئے۔ پاکستان بھی بن گیا مگر ہمیں وہاں جانے کی توفیق نہ ہوئی۔"

اس کے بعد خواجہ صاحب نے جمیلہ کا تعارف کرواتے ہوئے ہماری ساری کہانی مختصراً بیان کر دی اور کہا۔

"اس نے بتایا ہے کہ شاہد اور فیاض بھی خیریت سے بنگلہ دیش سے نکل گئے تھے۔"

میں نے خواجہ صاحب کو یہی بتایا تھا۔ اس خیال سے کہ خوامخواہ انہیں پریشانی لگ جائے گی۔ کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ شاہد اور فیاض جہاں ہوں گے خیریت سے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور دعا کی کہ اللہ میاں دونوں بھائیوں کو خیریت سے پاکستان پہنچا دے۔

ہمیں خواجہ صاحب کے ہاں رہتے ہوئے تین چار دن گزر گئے۔ اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ جمیلہ بہن کو تو گھر کے اندر ہی رہنا تھا۔ میں بھی گھر میں قید ہو کر رہ گیا۔ پہلے چٹا گانگ اور پھر کاکسز بازار کے مکان میں بند رہا۔ پھر بحری تیل بردار جہاز کے کیبن میں بند رہا۔ اب خواجہ صاحب کے مکان میں بند ہو گیا تھا۔ صرف رات کے وقت خواجہ صاحب مجھے اپنے ساتھ امجدیہ ہوٹل کے پیچھے مسلمانوں کے محلے میں ٹہلانے کے لئے لے جاتے۔ سارا دن میں مکان کی تیسری منزل والے کمرے میں بستر پر لیٹا اخبار رسالے پڑھتا۔

طبیعت بہت چاہتی تھی کہ کلکتہ شہر کی سیر کروں مگر خواجہ صاحب نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ خواجہ صاحب یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ جب دونوں ملکوں کے حالات معمول پر آجائیں گے اور پاکستانی سفارت خانہ بھی کھل جائے گا تو وہ ہمیں ان کے حوالے کر دیں گے اور سفارت خانے والے ہم دونوں کو پاکستان پہنچا دیں گے۔ یہ بڑا لمبا سلسلہ تھا کیونکہ دونوں ملکوں کے درمیان اگرچہ جنگ بند ہو چکی تھی مگر کشیدگی اتنی سنگین تھی کہ حالات معمول پر آتے نظر نہیں آتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے۔ جب اس خود ساختہ قید و بند کا ایک ہفتہ گزر گیا تو میری طبیعت باہر نکلنے کو مچلنے لگی۔ ایک روز خواجہ صاحب کسی کام سے کلکتے کے علاقے بالی گنج گئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے اڑھائی بج رہے تھے۔ جمیلہ درمیان والے کمرے میں بیگم خواجہ کے ساتھ گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی کہ میں نے سوچا کیوں نہ باہر کی سیر کی جائے۔ موقع اچھا ہے خواجہ صاحب بھی گھر پر نہیں ہیں۔

چنانچہ میں اوپر والی منزل کی سیڑھیاں اتر کر نیچے مکان کی ڈیوڑھی میں آ گیا۔ یہ سیڑھیاں ایسی تھیں کہ اوپر سے نیچے ڈیورھی تک بالکل سیدھی اترتی تھیں۔ میرے نیچے آنے کی گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں انہیں بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خیال تھا کہ لوئر چھہت پور روڈ پر جاؤں گا اور اگلے چوک تک ٹرام کار کی سیر کر کے واپس آ جاؤں گا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ ذکریا سٹریٹ میں بڑی رونق تھی۔ میں لوئر چھہت پور والے چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں خوب چہل پہل تھی۔ سگریٹ پان کی دکانوں پر ریڈیو بج رہے تھے۔ بنگلہ گانے نشر ہو رہے تھے۔ میری جیب میں انڈین کرنسی کے دس پندرہ روپے موجود تھے۔ میں نے سگریٹ پان کی ایک دکان سے کیونڈر کا سگریٹ خرید کر سلگایا اور وہیں فٹ پاتھ پر ایک طرف کھڑے ہو کر مزے سے کش لگانے لگا۔

اتنے میں ایک ٹرام کار آئی اور مجھ سے چند قدم آگے جا کر رک گئی۔ وہ اسکا سٹاپ تھا۔ میں بغیر سوچے سمجھے محض ٹرام کار کی سیر کرنے کے لئے دوڑ کر اس میں سوار ہو گیا۔ ٹرام کار ٹن ٹن کرتی چل پڑی۔

کنڈکٹر نے آکر مجھ سے بنگلہ میں کچھ پوچھا۔ ظاہر ہے یہی پوچھا ہو گا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ میں نے اردو میں کہا۔

"آگے کونسا چوک آئے گا؟"

میری زبان سے اردو کا فقرہ سن کر دوسرے بنگالیوں نے سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ کنڈکٹر نے بنگلہ نما اردو میں مجھ سے کہا۔

"آگے ڈلہوزی سکوائر آئے گا۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے مجھے ڈلہوزی سکوائر کا ایک ٹکٹ دے دو۔"

"آٹھ آنے نکالو۔"

آٹھ آنے سے میں نے اندازہ لگایا کہ ڈلہوزی چوک قریب نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ وہاں جا کر واپس آ جاؤں گا۔ ٹرام کار کی سیر بھی ہو جائے گی اور ڈلہوزی سکوائر بھی دیکھ لوں گا۔ میں نے ٹکٹ لے کر قمیض کی جیب میں رکھ لیا اور باہر دیکھنے لگا۔ یہاں زیادہ تر دکانیں چینیوں کی تھیں۔ یہ دندان ساز اور جوتا ساز تھے۔ ریستوران بھی دکھائی دیئے۔ لوئر چھہت پور روڈ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ کافی دور جا کر ٹرام کار بائیں مڑ گئی۔ اس طرح تین چار چوک عبور کرنے کے بعد ٹرام کار ایک کشادہ علاقے میں نکل آئی جہاں سبزے کے قطعے تھے۔ پارک تھے۔ دور دور اونچی ماڈرن عمارتیں کھڑی تھیں۔ ٹرام کار بازار کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ مجھے خیال آنے لگا کہ میں زیادہ دور نکل آیا ہوں۔ مجھے یہیں کسی بس سٹاپ پر اتر کر دوسری ٹرام کار میں واپس چلے جانا چاہیے۔ لیکن ٹرام کار رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نظر میں آ گیا ہوں۔ جن لوگوں نے اردو کا جملہ بولنے پر میری طرف دیکھا تھا ان میں ایک آدمی میری طرف دیر تک گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

یہ آدمی شکل سے بنگالی لگتا تھا۔ رنگ کالا تھا۔ عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ سر درمیان سے گنجا تھا۔ اس نے قمیض پتلون پہن رکھی تھی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ خواجہ صاحب کے مکان سے باہر نکل کر سخت غلطی کی ہے۔ یہ آدمی یقینی طور پر سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ ان دنوں سی آئی ڈی اور ملٹری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انٹیلی جینس کے آدمی ہر جگہ موجود ہوتے تھے۔ ان کا کام بنگلہ دیش سے بھاگ کر آئے ہوئے بہاریوں' پنجابیوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنا تھا۔

میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں میں پکڑا تو نہیں جاؤں گا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ اگلے سٹاپ پر اتر جاؤں گا اور واپس جانے والی ٹرام کار کا انتظار کرنے کی بجائے وہیں سے کوئی رکشا ٹیکسی پکڑ کر ذکریا سٹریٹ واپس آجاؤں گا۔

ٹرام کار ایک جگہ رکی تو کنڈکٹر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ڈلہوزی سکوائر آگیا ہے بابو۔"

میں جلدی سے نیچے اتر گیا اور فٹ پاتھ پر جس طرف سے ٹرام کار آئی تھی اس طرف چلنے لگا۔ میری نگاہیں تیزی سے ادھر ادھر کسی رکشا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ علاقہ بڑا کھلا کھلا تھا۔ سڑکیں بڑی چوڑی تھیں۔ گاڑیاں گزر رہی تھیں مگر کوئی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ بنگالی بھی میرے ساتھ ٹرام سے اترا ہے یا نہیں۔ میں نے بڑی چالاکی سے گردن کھجاتے ہوئے رک کر پیچھے نظر ڈالی تو دل کی دھڑکن ذرا تیز ہو گئی۔ وہ بنگالی میرے ساتھ ہی ٹرام کار سے اتر آیا تھا اور اب تہہ کیا ہوا اخبار ہاتھ میں دبائے فٹ پاتھ پر مجھ سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر چلا آرہا تھا۔ میں رک گیا اور ادھر ادھر کسی خالی ٹیکسی رکشا کو تلاش کرنے لگا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہ بنگالی بھی رک گیا تھا اور ایسے کھڑا تھا جیسے وہ بھی کسی خالی ٹیکسی یا رکشا دیکھ رہا ہو۔ میں نے دل میں کہا۔ دوست پھنس گئے ہو۔ اب کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرو کہ اس خفیہ پولیس والے بنگالی کو دھوکا دے کر نکل سکو کیونکہ اس طرح یہ آدمی تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اور کوئی پتہ نہیں کہ اگلے چوک میں کوئی بھارتی فوجی یا پولیس کا کوئی سپاہی نظر آگیا تو یہ مجھے پکڑ کر اسکے حوالے کر دے۔ جب دماغ میں کوئی ترکیب نہ آئی تو میں چل پڑا۔ ظاہر ہے میرے تعاقب میں لگے ہوئے بنگالی نے بھی اپنی

رفتار تیز کر دی ہوگی۔ میری نگاہ ایک قریبی عمارت پر گئی۔ وہاں انگریزی میں کسی فلم کا سائن بورڈ لگا تھا۔ یہ کوئی سینما ہاؤس تھا۔ اچانک ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔ دوپہر کے شو کا ٹائم ہو رہا تھا۔ میں بلڈنگ کی طرف مڑ گیا۔

بلڈنگ کی لابی میں کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ دیواروں پر انگریزی فلم کی تصویریں لگی تھیں۔ میں اس کھڑکی کی طرف لپکا جہاں سینما کے ٹکٹ لوگ لے رہے تھے۔ میں نے گیلری کا ایک ٹکٹ لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ یہاں سینما ہال کے دروازے کے باہر گیٹ کیپر کھڑا تھا۔ میں نے اسے ٹکٹ دکھایا۔ اس نے آدھا کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا اور دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ہال کمرے میں پردہ پر انگریزی فلم شروع ہو چکی تھی۔ پہلے تو اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ پیچھے سے گیٹ کیپر نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ پاس ہی ایک سیٹ خالی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ مجھے سکرین پر چلتی فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری نگاہیں گیلری کے اس گیٹ پر لگی تھیں جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ خفیہ پولیس والا بنگالی ضرور میرے پیچھے ہال میں آئے گا۔ مگر جب دس پندرہ منٹ گذر گئے اور وہ نہ آیا تو میں نے کسی حد تک اطمینان کا سانس لیا۔ میں اسے جل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ یقیناً مجھے سینما کے باہر کسی جگہ تلاش کر رہا ہو گا۔

مجھے چاہیے تھا کہ اسی وقت کسی دوسرے راستے سے سینما ہاؤس کی حدود سے نکل جاتا لیکن یہ میری ایک اور حماقت تھی کہ میں سینما ہال میں ہی بیٹھا رہا۔ اس خیال سے کہ تھوڑی دیر تک وہ بنگالی مجھے ادھر ادھر تلاش کرے گا جب میں اسے نہیں ملوں گا تو وہ چلا جائے گا۔ میں ناتجربہ کار تھا۔ اس قسم کی باتوں کا مجھے پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کم از کم بھارتی انٹیلی جنس سے مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ بنگالی میری تباہی کا سامان فراہم کر رہا ہو گا۔۔۔ سکرین پر فلم چل رہی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ کوئی مار دھاڑ والی انگریزی فلم تھی۔ جب مزید دس پندرہ منٹ گذر گئے تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لگا۔ کوئی مار دھاڑ والی انگریزی فلم تھی۔ جب مزید دس پندرہ منٹ گذر گئے تو میں نے سوچا کہ اب تک خفیہ والا جاچکا ہو گا۔ چنانچہ میں اٹھا اور گیلری میں سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ دو تین سیڑھیاں اترنے کے بعد خیال آیا کہ کہیں وہ بلا سامنے نہ کھڑی ہو۔ فوراً اوپر آگیا اور گیٹ کیپر سے پوچھا:۔

"یہاں باتھ روم کدھر ہے؟"

اس نے گیلری کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی راہ داری کی طرف اشارہ کیا:۔ " ادھر ہے۔"

یہ بڑی تنگ راہ داری تھی۔ اس کے آگے باتھ روم تھا۔ میں نے باتھ روم میں گھس کر اسکا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا اس کے پیچھے سے ضرور کوئی راستہ دوسری طرف جاتا ہو گا۔ میں پچھلی طرف سے نکلنا چاہتا تھا۔ اپنی طرف سے میں بڑی عقل مندی سے کام لے رہا تھا۔ باتھ روم کا ایک دروازہ دوسری طرف ضرور تھا مگر اسے اندر سے چٹخنی لگی تھی۔ میں نے آہستہ سے چٹخنی کھولی اور دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر دوسری طرف نگاہ ڈالی۔ دوسری جانب ایک چوکور گیلری تھی جہاں سے لوہے کا ایک چکردار زینہ نیچے سینما ہاؤس کی بغلی گلی کی طرف جاتا تھا۔ یہاں تین چار سگریٹ پان اور کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں تھیں۔ میں زینہ اتر کر گلی میں آگیا۔ یہ گلی سینما ہاؤس کی عمارت میں ہی تھی۔ آگے یہ بڑی سڑک پر جانکلتی تھی۔ میں بڑے آرام سے مگر احتیاط سے چوکس ہو کر گلی میں سے گذر کر سڑک پر نکلا ہی تھا کہ اچانک سامنے سے تین پولیس کے سپاہی میرے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ بنگالی خفیہ پولیس والا ان کے ساتھ ہی تھا۔

میرا رنگ اڑ گیا۔ یہ منحوس آدمی پولیس کو لے کر باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ میں اس طرف سے ہی باہر نکلوں گا۔ تینوں پولیس کانسٹیبلوں نے

رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ انہوں نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ خفیہ پولیس والا بنگالی مکاری سے مسکرا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر میرے بالکل سامنے آگیا۔ میں نے کہا:۔

"کیا بات ہے؟"

بنگالی نے کہا:۔ "ابھی بتاتے ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

وہ بڑی صاف اردو بول رہا تھا۔ میں نے کہا:۔ " میں یہیں سے آیا ہوں۔ کلکتے میں رہتا ہوں۔"

"کہاں رہتے ہو؟"

میرے زبان پر بالی گنج کا نام آیا۔ میں نے کہہ دیا:۔

"بالی گنج میں رہتا ہوں۔"

خفیہ پولیس والے نے کہا:۔ "مگر تم لوئر چِھت پور روڈ سے آ رہے تھے۔ وہاں تمہارا کون ہے؟ کس سے ملنے گئے تھے؟"

میں نے کہا:۔ "کسی سے نہیں۔ یونہی ٹرام کار کی سیر کر رہا تھا۔"

خفیہ پولیس والے نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا اور پوچھا:۔ "کیا تم پنجابی ہو؟"

میں نے کہا:۔ " بالکل نہیں۔ میں پنجابی نہیں ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ میں گھبرا گیا تھا۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور میں الٹ پلٹ جواب دے رہا تھا۔ کانسٹیبل نے کہا:۔ "تم بنگلہ دیش سے بھاگ کر آئے ہو۔ تم پاکستانی فوجی ہو۔ چلو ہمارے ساتھ۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس دوران کچھ بنگالی تماشہ دیکھنے وہاں جمع ہوگئے تھے۔ کسی نے بنگلہ میں پاکستانی جاسوس کہا۔ یہ دونوں الفاظ میری سمجھ میں آگئے۔ میں فوراً بولا:۔ میں بنگلہ دیش سے نہیں آیا۔ میں بالی گنج سے آیا ہوں۔ میں پاکستانی فوجی نہیں ہوں۔"

"بالی گنج میں کس کے پاس رہتے ہو؟"

اتنا مجھے ہوش تھا کہ مجھے کسی حالت میں بھی نہ تو خواجہ قمرالدین کا نام زبان پر لانا ہے اور نہ ان کے مکان کا ایڈریس ہی ان لوگوں کو دینا ہے۔ میں نے یونہی کہہ دیا:۔

"وہاں میری ماسی کا گھر ہے۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہہ دیا:۔ "ہاں مسلمان ہوں۔ ہمارا اصلی گھر دلی میں ہے۔ میں دلی سے یہاں اپنی ماسی کے پاس آیا ہوں۔"

اتنی دیر میں میری کھوئی ہوئی طاقت اور خود اعتمادی کسی حد تک بحال ہو چکی تھی۔ میں نے ان پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"تم مجھے یوں روکنے والے کون ہوتے ہو۔ تمہارے آئی جی پولیس میرے خالو کے دوست ہیں۔ میں ابھی انہیں فون کر کے بتاتا ہوں کہ تم لوگ ناحق مجھے پریشان کر رہے ہو۔"

ابھی یہ جملہ میرے منہ میں ہی تھا کہ خفیہ پولیس والے بنگالی نے آگے بڑھ کر زور سے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ اس وقت میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میرے اندر جیسے ایک دھماکہ ہوا۔ میں نے خفیہ پولیس والے کو پنجابی زبان کی ایک انتہائی گندی گالی دیتے ہوئے زور سے دھکا دیا۔ وہ پولیس کے سپاہیوں پر گرا۔ تینوں پولیس والے لڑکھڑا گئے۔ بس یہی ایک لمحہ تھا جو مجھے اپنی ساری زندگی سے انتہائی قیمتی لگا۔ میں سڑک پر بھاگ اٹھا۔ میں اتنی تیزی

سے بھاگ رہا تھا جیسے میرے پیچھے کوئی آدم خور شیر لگا ہوا ہو۔ سامنے فٹ پاتھ پر دو عورتیں آ رہی تھیں۔ میں انہیں پیچھے دھکیل کر نکل گیا۔ فٹ پاتھ پر لوگ آجا رہے تھے جس کی وجہ سے پولیس کانسٹیبل مجھ پر فائر نہیں کر رہے تھے۔ مگر ان کے بھاگتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آوازیں مجھے اپنے پیچھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اب انہوں نے پکڑلو۔ اسے پکڑلو۔ یہ پاکستانی جاسوس ہے۔ اس قسم کی آوازیں دینی شروع کر دی تھیں۔

فٹ پاتھ پر پہلے تو لوگ مجھے دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ اب وہ مجھے پکڑنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ یہ ایک نئی مصیبت نازل ہوگئی تھی۔ ایک جگہ دائیں جانب مجھے ایک تنگ سا بازار نظر آیا۔ میں دوڑتے دوڑتے اس بازار میں گھس گیا۔ پیچھے سے فائر کے دو دھماکے ہوئے۔ یہ ہوائی فائر تھے۔ مگر میں بھاگتا چلا گیا۔ آگے جا کر بازار ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ میں بھی گلی میں گھس گیا۔ میرا سانس پھول رہا تھا مگر نوجوانی کی عمر تھی۔ میرے اندر تمام توانائیاں محفوظ تھیں اور پھر موت کے خوف سے کچھ مزید توانائیاں بیدار ہوگئی تھیں۔ گلی میں پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرا اور پولیس والوں کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ مزید دو ہوائی فائر ہوئے۔ مجھے ایک بلڈنگ کی ڈیوڑھی نظر آئی' میں اس میں گھس گیا۔ آگے ایک چوڑا زینہ اوپر جاتا تھا۔ میں تیز تیز زینہ چڑھ گیا۔ نیچے سے لوگوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بنگالی لوگ بھی میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ دوسری منزل پر ایک گیلری آگئی۔ میں نے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ ادھر کچرا گلی تھی۔ بمبئی اور کلکتے میں کچھ پرانی عمارتیں ابھی تک موجود ہیں جن کے پچھواڑوں میں ایک کچرا گلی ضرور ہوتی ہے۔ اسے کچرا گلی اس لئے کہتے ہیں کہ بلڈنگ کے فلیٹوں میں رہنے والے اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ کھڑکیوں میں سے اس گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ رات کو یا دن کے وقت کمیٹی کا ٹرک آتا ہے اور وہ کوڑا اٹھا کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لے جاتا ہے۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے کچرا گلی میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر چھلانگ لگادی۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پیچھے پولیس لگی تھی۔ پولیس کے ساتھ بنگالی بھی شامل ہوگئے تھے۔ میرے لئے جان بچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر گرتے ہی اٹھا اور جس طرف میرا منہ تھا' اس طرف دوڑ پڑا۔

اوپر سے مجھ پر ایک فائر ہوا۔ پھر دوسرا فائر ہوا۔ یقین کریں میری زندگی تھی کہ میں بچ گیا۔ گولیاں میرے بالکل قریب سے ہوکر گلی کے فرش پر تڑاخ تڑاخ لگیں۔ گلی کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ جہاں کوڑا اٹھانے والا بڑا سا ٹرک کھڑا تھا۔ گیلری کے اوپر سے پولیس نے دو تین فائر کردیئے۔ مگر یہ ہوائی فائر تھے۔ کیونکہ اس وقت ٹرک ڈرائیور دونوں بازو کھول کر مجھے پکڑنے کے لئے میرے سامنے آگیا تھا۔ پولیس نے اس کو بچانے کی خاطر مجھ پر فائر نہیں کیا تھا۔ اوپر سے بنگلہ زبان میں کوئی چلایا۔ میں سمجھ گیا کہ ٹرک ڈرائیور کو پولیس نے مجھے پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اس بنگالی ڈرائیور کے پیٹ میں ٹکر ماری۔ وہ پیچھے کو گر پڑا۔ میں اس کے اوپر سے چھلانگ لگا کر ٹرک کی دوسری طرف نکل آیا۔ ادھر بھی کچھ لوگ مجھے پکڑنے کے لئے موجود تھے۔ وہاں سارے علاقے میں فائرنگ کی وجہ سے لوگ جمع ہوگئے تھے اور سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ایک پاکستانی جاسوس کو پولیس پکڑنے کی کوشش کررہی ہے۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ مجھے ایک مکان کی کھلی ہوئی کھڑکی نظر آئی۔ یہ پہلی منزل کی کھڑکی تھی اور اس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ میں دوڑ کر کھڑکی میں گھس گیا۔

دوسری طرف ایک عورت بیٹھی کشیدہ کاری کررہی تھی۔ وہ مجھے اچانک کمرے میں گھستے دیکھ کر چیختی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف بھاگی۔ میں بھی کمرے سے

نکل کر باہر کو دوڑا۔ آگے صحن تھا۔ صحن میں سے گذرا تو دو تین مرغیاں زور زور سے چیختی ہوئی ادھر ادھر بھاگ گئیں۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ میں بھاگتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا۔ مگر قسمت نے میرے لئے جو لکھ رکھا تھا' وہ میرے سامنے موجود تھا۔ مکان کے باہر بنگالیوں کا ایک ہجوم میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ جیسے ہی میں باہر نکلا' انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔ کوئی ٹھڈے مارنے لگا۔ کوئی میری گردن پر مکے مارنے لگا۔ اتنے میں پولیس وہاں آگئی۔ پولیس نے مجھے بنگالیوں سے چھڑا کر اسی وقت میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور کھینچتے ہوئے گلی میں سے باہر بازار میں لے آئے۔ خفیہ پولیس والا بنگالی پولیس کے ساتھ ساتھ تھا۔

بازار میں ایک طرف پولیس کی ویگن کھڑی تھی۔ مجھے دھکا دے کر ویگن میں ڈالا۔ جس سپاہی نے مجھے ہتھکڑی لگا رکھی تھی' وہ اور ایک دوسرا کانسٹیبل میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ویگن کا دروازہ بند کردیا گیا اور ویگن بازار میں ایک طرف چل پڑی۔ میں ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اب میری گردن اور میری کمر بھی درد کررہی تھی۔ بنگالیوں نے بڑی بیدردی سے مجھے پیٹا تھا۔ اگر پولیس والے وہاں نہ آتے تو یہ بنگالی مجھے ہلاک کرڈالتے۔ دونوں سپاہی ویگن کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں ویگن کے فرش پر بیٹھا تھا۔ بے حد پچھتا رہا تھا کہ کیوں خواجہ صاحب کے مکان سے قدم باہر نکالا۔ اگر میں ان کے گھر میں ہی رہتا تو اس مصیبت میں کبھی نہ پھنستا۔

ویگن خدا جانے مختلف موڑ مڑتے ہوئے کسی عمارت کے احاطے میں داخل ہوئی۔ مجھے باہر نکالا گیا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ برآمدے میں پولیس کے دو کانسٹیبل ایک کمرے کے باہر ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ شاید یہ پولیس سٹیشن تھا۔ مجھے اسی وقت تھانے کی حوالات میں بند کردیا گیا۔ اب مجھے ہتھکڑی نہیں لگی ہوئی تھی مگر میں حوالات کے سلاخوں والے دروازے کے پیچھے قید پڑا تھا۔ حوالات ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ کونے میں دو تین پرانے کمبل پڑے تھے۔ ایک مریل سا بنگالی کونے میں بیٹھا مجھے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے بنگلہ میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں جواب دینے کی بجائے وہیں دیوار سے لگ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس حوالاتی نے دو تین بار بنگلہ میں مجھ سے سوال کئے۔ جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا: "ابے تو کون ہے..... کیا کسی کی جیب کاٹ کر بھاگا ہے....."

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پاکستانی جاسوس سمجھ لیا ہے۔ اب یہ مجھے ہر طرح کی اذیت دیں گے اور پوچھیں گے کہ میں یہاں کہاں رہتا ہوں' میرے دوسرے ساتھی کون کون ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ مجھے رسالوں میں پڑھی ہوئی جاسوسی کی وہ ساری کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں کسی ملک کا جاسوس جب پکڑا جاتا تھا تو اسے غیر انسانی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ ان اذیتوں کے خیال سے ہی سے میرا حلق خشک ہونے لگا۔

حوالات کے باہر ایک مسلح بنگالی کانسٹیبل پہرہ دے رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ شاید اسے بنگلہ میں بتادیا گیا تھا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں جو میں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہی خفیہ پولیس والا منحوس بنگالی ایک کانسٹیبل کے ہمراہ حوالات کی طرف آیا۔ مجھے حوالات میں سے نکال کر دوبارہ ہتھکڑی لگادی گئی۔ اس کے بعد مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ ایس ایچ او کا دفتر ہی ہو گا۔ ایک بنگالی تھانیدار کی وردی پہنے میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور بنگلہ زبان میں خفیہ پولیس والے بنگالی سے باتیں کرنے لگا۔ خفیہ پولیس والا بنگالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھا۔ بنگالی تھانیدار نے قلم رکھ دی۔ میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میری ہتھکڑی کی زنجیر جس کانسٹیبل کی پیٹی سے بندھی ہوئی تھی' وہ میرے پاس ہی اٹن شن کھڑا تھا۔ بنگالی تھانیدار نے ہاتھ کے اشارے سے کہا:۔

"اٹھو۔ اٹھ کر کھڑے رہو۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار نے اردو میں مجھ سے بات کی تو میں نے ہمت کر کے اسے کہا:۔

"سر! میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔"

اس کی تیز نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو کچھ باتیں چھپا کر باقی سب کچھ صاف صاف بتادینا چاہیے۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"سر! میں پنجابی ضرور ہوں۔ مگر میرا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ڈھاکے میں تھا۔ جب ڈھاکہ فال ہوا تو جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور دربدر پھرتا بھارت کی سرحد پار کر کے یہاں آگیا۔ بس' سر یہی میری کہانی ہے۔ میں جنگی قیدی نہیں ہوں۔ میں جاسوس بھی نہیں ہوں سر۔"

میں ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔ تھانیدار نے مسکرا کر خفیہ پولیس والے کی طرف دیکھا اور انگریزی میں اسے کہا: "اگرچہ اسکی عمر زیادہ نہیں ہے مگر یہ بڑا تجربہ کار جاسوس ہے۔"

شاید اسکا خیال تھا کہ میں انگریزی زبان نہیں سمجھ سکتا۔ پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

"دیکھو! میں ایک بات تمہیں اسی وقت کہہ دینا چاہتا ہوں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں بتادو کہ تمہارے ساتھی جاسوس کہاں کہاں پہ ہیں اور تمہارا خفیہ ٹھکانہ کلکتے میں کہاں ہے۔ اگر تم نے صحیح صحیح بتادیا تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کلکتے میں کہاں ہے۔ اگر تم نے صحیح صحیح بتادیا تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اپنی خاص نگرانی میں تمہیں پاکستان پہنچادوں گا۔"

میں نے اپنی طرف سے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا:

"سر! میں قسم اٹھانے کو تیار ہوں کہ نہ تو میں پاکستان کا جاسوس ہوں اور نہ میرا یہاں کوئی خفیہ ٹھکانہ ہے اور نہ کوئی ساتھی ہے۔"

اس پر بنگالی تھانیدار نے خفیہ پولیس والے کی جانب دیکھا اور بنگلہ زبان میں کچھ کہہ کر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ خفیہ پولیس والے نے پولیس کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکیل کر باہر نکالا اور اسی ویگن کی طرف لے آیا جہاں سے مجھے نکال کر حوالات میں بند کیا گیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر ویگن میں بٹھادیا گیا۔ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ مسلح کانسٹیبل ساتھ بیٹھا تھا۔ سامنے والی سیٹ پر بھی ایک مسلح کانسٹیبل آکر بیٹھ گیا تھا۔ ویگن کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ میں نے خفیہ پولیس والے کو آتے دیکھا۔ وہ ویگن کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ویگن سٹارٹ ہوئی اور تھانے کے احاطے سے نکل کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس ویگن میں شاید حوالاتیوں کو حوالات سے تاریخ بھگتنے کے لئے عدالت میں لایا اور لے جایا جاتا تھا۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی۔ صرف آمنے سامنے اوپر دو روشندان تھے۔ ویگن کافی دیر تک شہر کی سڑکوں پر چلتی رہی۔ پھر غیر آباد علاقہ شروع ہوگیا۔ باہر کے منظر کی تھوڑی تھوڑی جھلک مجھے ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے جو کھڑکی تھی اس میں سے نظر آجاتی تھی۔ ہم دریا کے پل پر سے بھی گذرے۔ اب ویگن ایسی جگہ سے گذر رہی تھی جہاں آس پاس درخت ہی درخت تھے۔ راستہ بھی کچا تھا۔ ویگن کو دھچکے لگ رہے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ مجھے کہاں لے کر جارہے تھے۔

ویگن ایک پرانی عمارت کے صحن میں آکر رک گئی۔

مجھے ویگن سے باہر نکالا گیا۔ عمارت شکستہ ہورہی تھی۔ برآمدے میں لمبے لمبے ستون تھے جن کی سفیدی اور سیمنٹ جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔ ساری عمارت پر ایک نحوست اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی آدمی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ عمارت کے اوپر کوئی بورڈ بھی نہیں لگا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ لوگ مجھے یہاں قتل کرنے کے لئے لائے ہیں۔ مجھے ایک اونچی چھت والے ویران کمرے میں پہنچادیا گیا۔ یہاں سوائے لوہے کی ایک چارپائی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کمرے کا دروازہ لوہے کا تھا۔ جب کانسٹیبل نے اسے کھولا تو ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کسی قلعے کا پرانا دروازہ کھل رہا ہو۔

مجھے چارپائی پر بٹھا کر کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ اس دوران دوسرا کانسٹیبل اپنی رائفل کی نالی میری طرف کئے کچھ فاصلے پر کھڑا رہا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا:

"یہ کونسی جگہ ہے بھائی۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔"

کانسٹیبل نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اس میں ہتھکڑی ڈالی اور اس کی زنجیر لوہے کے پلنگ کے ساتھ باندھ کر وہاں تالا لگادیا۔ اب میں لوہے کے پلنگ کے ساتھ زنجیر سے بندھ گیا تھا۔ زنجیر تین چار فٹ لمبی تھی۔ میں سخت مایوسی کے عالم میں لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دونوں کانسٹیبل چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ دروازے کے اوپر کوئی دو فٹ چوڑا چھوٹا سا روشندان تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ اس میں سے دن کی روشنی آرہی تھی۔ میں چپ چاپ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے آگے میرے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ میں خوامخواہ گھر سے نکل آیا اور اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ زنجیر اتنی لمبی تھی کہ میں پلنگ کے پاس دو قدم آگے اور دو قدم پیچھے تک چل سکتا تھا۔ باہر برآمدے میں بھاری جوتوں کی آواز کے ساتھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ آوازیں قریب آرہی تھیں۔ باتیں بنگالی میں ہو رہی تھیں۔ تالہ کھلنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ دو انڈین ملٹری پولیس کے سپاہی اندر آگئے۔ دونوں بنگالی تھے۔ ان کے رنگ گہرے سانولے تھے اور جسم دبلے تھے۔ مگر بڑے چاق و چوبند تھے۔ انہوں نے پستول لگا رکھے تھے۔ خفیہ پولیس والا بنگالی اور ایک پولیس کانسٹیبل بھی ساتھ تھا۔ ملٹری پولیس کے آدمیوں نے قریب آکر میرا سر بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ پھر ان میں سے ایک نے اردو میں پوچھا:

"تمہارے ساتھ ڈھاکے سے بھاگ کر اور کون کون فوجی جوان کلکتے آیا تھا؟"

میں نے اپنا پرانا بیان دہرایا تو دونوں فوجی مجھے پیٹنے لگے۔ میں نے دونوں بازوؤں میں اپنا سر چھپا لیا۔ ایک فوجی نے انگریزی میں دوسرے سے کہا: "اسے گیریژن لے چلو۔"

انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی رہنے دی۔ پلنگ کے ساتھ بندھی ہوئی زنجیر کو کھول دیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے آئے۔ احاطے میں ایک ملٹری ویگن کھڑی تھی جس کی ایک جانب ایک فوجی سٹین گن لئے کھڑا تھا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر فوجی گاڑی میں آلوؤں کی بوری کی طرح پھینکا۔ دونوں ملٹری پولیس والے پستول لے کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور گاڑی فوجی گیریژن کی طرف چل پڑی۔

مار کھاتے جانے اور مار پیٹ کو برداشت کرتے جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ جس فوجی گیریژن میں مجھے لے جایا گیا' وہ دریا کے کنارے پر تھا۔ یہاں مجھے تین دن تک رکھا گیا۔ دو فوجی افسروں نے مجھ پر اتنا تشدد کیا کہ میں بار بار بے ہوش ہوا۔ اس قسم کا تشدد اور اذیت میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ میرے ناخنوں میں کیل چبھوئے گئے۔ مجھے لوہے کی زنجیر کے ساتھ باندھ کر الٹا لٹکایا گیا۔ میرے جسم کے نازک حصوں پر جلتے ہوئے سگریٹ لگائے گئے۔ لیکن میں اپنے آپ کو داد دیتا ہوں کہ میں نے انہیں بالکل نہ بتایا کہ میں کلکتے میں کس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار میں نے زکریا سٹریٹ اور خواجہ قمر الدین کا نام لے لیا تو نہ صرف یہ کہ خواجہ صاحب کا خاندان برباد ہو جائے گا' بلکہ جمیلہ بہن کی زندگی بھی تباہ ہو جائے گی اور وہ پاکستان پہنچنے کی بجائے کلکتے کے کسی قحبہ خانے میں بٹھا دی جائے گی۔ چھ روز تک مجھ پر ملٹری گیریژن میں بھارتی بنگال رجمنٹ کے انٹیلی جنس والے تشدد کرتے رہے اور میں بڑی ثابت قدمی سے اس تشدد کو برداشت کرتا رہا۔ اس کے بعد جب انہیں مجھ سے کوئی معلومات نہ مل سکیں تو مجھے کوارٹر گارڈ میں بیڑیاں ڈال کر بند کر دیا گیا۔

تین دن میں ملٹری کی کوارٹر گارڈ میں بند رہا۔ چوتھے دن مجھے باہر نکال کر گاڑی میں بٹھا کر سٹیشن پر لے جایا گیا۔ تین فوجی میری نگرانی کے لئے ساتھ تھے۔ مجھے ہتھکڑی لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ مجھے آمنسول لے جایا جا رہا ہے۔ رات کو ہم ایک ٹرین میں بیٹھے۔ دوسرے دن صبح گاڑی نے آمنسول پہنچایا۔ یہاں ایک بڑی جیل تھی۔ مجھے اس جیل کے حکام کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ جیل بھی ایک جنم ہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میری مار پیٹ شروع ہو گئی۔ پھر میری انگلیوں کے نشانات لئے گئے۔ میری تصویریں اتاری گئیں۔ پھر ایک پھانسی کی کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد یہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی تشدد کا نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کوئی ایسی اذیت نہ تھی جو مجھے نہ دی گئی۔ لیکن میرے پاس کچھ بتانے کو ہوتا تو میں بتا بھی دیتا۔ بس جب وہ مجھ سے پوچھتے کہ میں کلکتے میں کسی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا تو میں اپنی زبان بند کر لیتا۔ یہی کہتا کہ ریلوے سٹیشن پر رات کو سوجاتا تھا۔ میں نے کسی بھی جگہ خواجہ قمرالدین کا نام نہ لیا۔ بالی گنج کے بارے میں مجھ سے پوچھا گیا کہ تم کہتے تھے کہ تم بالی گنج میں اپنی ماسی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے' بتاؤ ان کا مکان کہاں پر ہے۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا۔

آسنسول کی جیل میں مجھ پر پندرہ روز تک تشدد ہوتا رہا۔ میرا وزن کم ہوگیا۔ جسم پر جگہ جگہ جلے ہوئے زخم تھے۔ ایک آنکھ سوج گئی تھی۔ میری نوجوانی کی عمر تھی کہ یہ سارا ٹارچر برداشت بھی کرتا رہا اور ساتھ ساتھ جسم کے زخم بھی مندمل ہوتے رہے۔ آخر تنگ آکر آسنسول کی جیل والوں نے مجھے چکی میں بند کر دیا۔ یہاں صبح شام گنتی کے وقت تھوڑی دیر کے لئے مجھے باہر نکالا جاتا۔ معلوم ہوا کہ جیل میں کچھ پنجابی اور بہاری بھی ہیں جو میری طرح بنگال سے فرار ہو کر انڈیا آگئے تھے اور یہاں آکر پکڑے گئے۔ ان پر بھی تشدد کیا جارہا تھا۔ دور دور سے ہم ایک دوسرے کو پہچان کر ایک دوسرے سے سلام دعا کر لیتے تھے۔ آسنسول کی جیل میں پھانسی کی کوٹھڑی میں پڑے پڑے مجھے ایک مہینہ گذر گیا۔ اس کے بعد مجھے دوسرے قیدیوں کی بارک میں پہنچا دیا گیا۔

دوسرے قیدیوں کے پاس آکر طبیعت کچھ بہل گئی۔ یہاں مجھے تین پنجابی ایک پٹھان اور بہاری بھی ملے۔ وہ لوگ مشرقی پاکستان میں دوکانداری کرتے تھے۔ ڈھاکہ فال ہوا تو جانیں بچاکر انڈیا کا بارڈر کراس کر کے کلکتے آگئے۔ یہاں انہیں پاکستانی جاسوس کہہ کر جیل میں ڈال دیا گیا اور بے پناہ تشدد کیا گیا۔

پنجابیوں میں عمار نام کا ایک قیدی تھا جو لاہور کا رہنے والا تھا۔ میری اس سے دوستی ہوگئی۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ ڈھاکہ میں ریلوے سٹیشن کے پاس اس کی تکے کباب کی دکان تھی۔ ڈھاکہ فال ہوتے ہی اس کی دکان توڑ کر لوٹ لی گئی۔ عمار چٹا گانگ کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ بتانے لگا:

"میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ کچھ روز پہلے میں نے اپنے بال بچوں کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر لاہور پہنچا دیا تھا۔ بنگالیوں نے پنجابیوں پر جو ظلم کئے ہیں ایسے ظلم کبھی دیکھے نہیں تھے۔ کبھی سنے نہیں تھے۔ عورتوں سے دودھ پیتے بچے چھین کر انہیں میخوں کے ساتھ درختوں پر ٹھونک دیا گیا۔ خدا جانی کتنی عورتوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ ہزاروں عورتیں یہاں کلکتے میں لا کر بیچ دی گئیں۔"

ہم تقریباً روز بیٹھ کر آپس میں اسی قسم کی باتیں کرتے۔ ایک بہاری خلیل بھی ہمارا دوست بن گیا۔ ایک روز میں نے عمار سے کہا:

"یہاں تو ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ہمیں غیر قانونی طور پر جیل میں ڈالا ہوا ہے۔ نہ ہم پر مقدمہ چلایا گیا۔ نہ قید سنائی گئی۔ اس طرح تو ہم ساری عمر یہاں پڑے رہیں گے اور کوئی ہماری خبر تک لینے نہیں آئے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے فرار ہونے کا کوئی پروگرام بنانا چاہئے۔"

اس پر بہاری نوجوان خلیل نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا:

"بھائی آہستہ بولو۔ یہاں جیل والوں کے مخبر بھی ہیں جو قیدی بن کر رہ رہے ہیں۔ انہیں اسی لئے یہاں ڈالا گیا ہے کہ ہماری ایک ایک منٹ کی رپورٹ اوپر والوں کو دیں۔"

میں چپ ہوگیا۔ بہاری نے قریب ہو کر آہستہ سے کہا: "کل مشقت کے وقت باہر بات کریں گے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمیں دن کے وقت جیل کے پچھلے احاطے میں لے جاکر ہم سے مشقت لی جاتی ہے۔ کوئی پٹ سن کی رسیاں بٹتا' کوئی بیڑیاں بناتا' کوئی ناریل کی چھال کی صفیں وغیرہ بناتا تھا۔ میں اور عمار پٹ سن کی رسیاں بٹا کرتے تھے۔ ہم یہ رسیاں ہاتھوں سے بٹتے تھے۔ عمار ہم سے ذرا دور تھا۔ بہاری میرے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ اگلے دن میں نے اسے کہا:۔

"خلیل بھائی! اب بتاؤ یہاں سے فرار ہونے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

خلیل کہنے لگا:۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم جیل سے فرار ہو بھی گئے تو اخباروں میں دوسرے دن ہماری تصویریں چھپ جائیں گی کہ دو پاکستانی جاسوس جیل توڑ کر بھاگ گئے ہیں' ان کو پکڑنے والے کو بھاری انعام ملے گا۔ پھر ہم اس علاقے میں بالکل اجنبی ہیں۔ ہمارے پاس پیسہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی بس یا ریل میں ٹکٹ لے کر بیٹھ سکیں۔ اس کے علاوہ اس سارے علاقے میں کلکتہ سے بمبئی تک اور آسنسول سے دلی آگرے اور پنجاب کی سرحدوں تک فوج' پولیس اور خفیہ پولیس کا راج ہے۔ خفیہ پولیس والے تو ہر شہر میں جگہ جگہ پھر رہے ہیں۔ ذرا کسی پر شک پڑتا ہے کہ یہ مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آیا ہے تو اسے وہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ہم فرار ہو کر کہاں جائیں گے؟ میں بہار میں اپنے گھر چلا بھی گیا تو مجھے وہاں سے دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ تم پنجابی ہو مگر سوال یہ ہے کہ تم پاکستان کس طرح جاسکو گے۔ سرحدیں بند پڑی ہیں۔ بارڈر پر فوج بیٹھی ہے۔ پہلے سمگلر آتے جاتے رہتے تھے۔ اب فوج کے ڈر کی وجہ سے وہ بھی گھروں میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔ فرار ہونے کے بعد ہمیں شہر شہر سہمے ہوئے پھرنا ہوگا کہ ابھی پکڑے گئے کہ پکڑے گئے۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ہم اسی جیل میں پڑے رہیں۔ ایک نہ ایک دن تو حالات ٹھیک ضرور ہوں

گے۔ پھر ہم کوئی اچھا سا وکیل کرلیں گے اور ہمیں جیل سے قانونی طور پر رہائی مل جائے گی۔"

میں نے خلیل سے کہا:۔ "بھائی! تمہارے لئے تو یہ ساری باتیں درست ہیں مگر میرے لئے یہ غلط ہیں۔ تم بھارت کے رہنے والے ہو۔ یہاں سے بنگال گئے تھے۔ وہاں سے آئے تو تم پر جاسوسی کا الزام لگاکر دھر لیا گیا۔۔۔ کل کو حالات معمول پر آگئے تو تم رہا ہو کر اپنے گھر جاسکتے ہو۔ مگر میرا گھر پاکستان میں ہے۔ میرے لئے تو یہ سارے کا سارا ہندوستان ایک جیل خانہ ہے۔ مجھے تو اس وقت تک یہاں سے نجات نہیں مل جاتی جب تک میں اپنے وطن پاکستان نہیں پہنچ جاتا۔"

خلیل کہنے لگا:۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ ابھی یہاں سے فرار ہونے کا خیال دل سے نکال دو۔ تھوڑے دن انتظار کرلو۔ شاید حالات سدھر جائیں۔"

میں سمجھ گیا کہ خلیل میرے ساتھ فرار نہیں ہونا چاہتا۔ میں نے دوسرے دن اپنے لاہور کے پنجابی شہری عمار سے فرار کی بات کی تو وہ کہنے لگا:۔

"بھائی! میری عمر فرار ہونے اور دربدر دھکے کھانے کی نہیں ہے۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ فرار ہونے کو ضرور تیار ہو جاتا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ عمار نے بھی انکار کر دیا تھا۔ میں نے دل میں فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میں جیل کے ملازموں' گارڈوں اور پہرہ داروں کے معمولات کی نگرانی کرنے لگا کہ کس گیٹ پر دن کو کون ہوتا ہے اور رات کو کون ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ جیل کے دو ٹاور ہیں جن میں مشین گنوں کے مورچے نہیں ہیں بلکہ دو سپاہی بندوقیں لے کر پہرہ دیتے ہیں۔ دن کو دو دوسرے سپاہی آجاتے۔ جیل کے دو دروازے تھے۔ ایک صدر دروازہ تھا جو جیل کے بڑے احاطے میں کھلتا تھا۔ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بعد دوسرا دروازہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں اور بارکوں کی طرف کھلتا تھا۔ پھانسی کی تین کوٹھڑیاں تھیں۔ ان کے اردگرد ایک علیحدہ جیل نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ لوہے کے جنگلے لگے تھے۔ جیل کی کافی اونچی چار دیواری تھی۔ رات کو یہاں بجلی کے بلب روشن ہوجاتے تھے۔ میں نے کافی سوچ بچار کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہاں سے فرار کا صرف ایک ہی طریقہ ہوسکتا تھا کہ باہر سے جب راشن سپلائی کرنے والا ٹرک آئے تو اس میں چھپ کر بیٹھ جاؤں اور اس کے ساتھ ہی جیل سے باہر نکل جاؤں۔ اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

سپلائی والا ٹرک راشن اور دوسری ضروریات کی چیزیں لے کر ہفتے کی شام کو آتا تھا اور جیل کے بڑے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کچن کے سامنے آکر رک جاتا تھا۔ میں ہفتے کی شام کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک مجھے پتہ چلا کہ مجھے اور میرے بہاری ساتھی کو دلی کی بدنام زمانہ تہاڑ جیل میں منتقل کیا جارہا ہے۔ میرا فرار کا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ جس روز ہماری منتقلی کے آرڈر آئے' اسی روز دوپہر ہم دونوں کو ہتھکڑیاں لگاکر جیل کی گاڑی میں بٹھاکر دو پولیس کانسٹیبلوں کی حفاظت میں آسنسول کے ریلوے سٹیشن پر لے جایا گیا۔ گاڑی آئی تو ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ یہ پولیس کا ڈبہ تھا۔ وہاں اس میں پہلے سے بھی پولیس گارڈ موجود تھی جب انہیں پتہ چلا کہ ہم دونوں پاکستانی جاسوس ہیں تو ان بنگالی پولیس والوں نے ہمیں برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ ہمیں ڈبے کی لیٹرین کے پاس ہی فرش پر بٹھادیا گیا۔ ہم دونوں کی ہتھکڑیوں کی زنجیریں سپاہیوں نے اپنی پیٹی سے اتار کر ڈبے کی سیٹ کے ساتھ جو لوہے کی سلاخ لگی تھی' اس کے ساتھ باندھ دیں۔

ہم دونوں بے بسی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ خلیل بنگلہ زبان جانتا تھا۔ پولیس والے آپس میں ہم پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ بہاری نے میری طرف منہ کرکے سرگوشی میں کہا۔

"یہ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں۔"

گالیاں تو معمولی بات تھی۔ وہ اگر ہمیں ٹھڈوں سے مارنا پیٹنا بھی شروع کردیتے تو ہم کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ ہمیں جیل میں ابھی تک قیدیوں والا لباس نہیں پہنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہم وہ قیدی نہیں تھے جنہیں عدالت کی طرف سے سزا کا حکم سنایا گیا ہو۔ ہمیں تو ویسے ہی قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ خلیل کرتے پاجامے میں تھا۔ میں نے قمیض پتلون پہنی ہوئی تھی۔ میرے دونوں کپڑے بے حد میلے کچیلے ہورہے تھے۔ میری تھوڑی تھوڑی شیو بھی بڑھ آئی تھی۔ جیل میں دو روز پہلے میں نے شیو بنوائی تھی۔ میرے پاؤں میں چمڑے کے بوٹ تھے۔ جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹرین آسنسول سے روانہ ہوگئی۔ ہمارے ساتھ ہی ڈبے کا دروازہ تھا جو بند کردیا گیا تھا۔ چونکہ ہمیں ہتھکڑیاں لگی تھیں اور ہم لوہے کی زنجیر کے ساتھ سیٹ کے ساتھ بندھے ہوئے تھے' اس لئے پولیس کے سپاہی ہم سے بہت حد تک بے نیاز ہوگئے تھے اور ٹرین کے سٹیشن سے نکلتے ہی انہوں نے تاش کھیلنا شروع کردی تھی۔ آسنسول سے آگے صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ ٹرین شاید کوئی سپیشل ٹرین تھی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی اس نے سپیڈ پکڑلی تھی اور تیز رفتاری سے اڑی جارہی تھی۔

☆☆☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمیں دوسرے روز دلی پہنچنا تھا۔

شام ہوئی تو ہمیں تھوڑے سے چاول کھانے کو دیئے گئے۔ ہمیں باتھ روم میں جانا ہوتا تو زنجیر پکڑ کر ایک سپاہی باہر کھڑا رہتا۔ باتھ روم سے باہر آنے کے بعد ہمیں دوبارہ سیٹ کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ جب رات کا اندھیرا ہو گیا تو ڈبے کے دروازے کو مقفل کر دیا گیا۔ اب دروازہ نہ اندر سے کھل سکتا تھا نہ ہی باہر سے۔ میں اور میرا بہاری دوست خلیل دروازے کے ساتھ لگ کر فرش پر بیٹھے تھے۔ ٹرین کسی سٹیشن پر کھڑی ہو جاتی۔ کسی کو چھوڑتی ہوئی گزر جاتی۔ ہماری ایک ایک کلائی میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ہم آپس میں آہستہ آہستہ کبھی کبھی کوئی بات کر لیتے تھے۔ اگرچہ ہمیں اس کی اجازت نہیں تھی مگر ٹرین کے شور میں ڈبے میں بیٹھے ہوئے پولیس والوں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہم نے آپس میں کوئی بات کی ہے۔

میری کلائی ہتھکڑی کی وجہ سے درد کرنے لگی تھی۔ میں نے ہتھکڑی ذرا سی آگے کر کے کلائی کو سہلایا تو میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہتھکڑی اتنی تنگ نہیں ہے اور کوشش کرنے اور ہتھیلی کو پوری طرح سکیڑنے سے میرا ہاتھ ہتھکڑی میں سے نکل سکتا ہے۔ میں آہستہ آہستہ ہتھکڑی کو کلائی پر آگے کی طرف کرنے

لگا۔ انگوٹھے کی ہڈی پر آ کر ہتھکڑی کا کڑا رک گیا۔ میں نے انگوٹھے کو دو تین بار اوپر نیچے کیا تو ہتھکڑی کا کڑا آگے کو کھسک گیا۔ میں نے جلدی سے اسے پیچھے کر دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔

میرے دل کی دھڑکن اس انکشاف سے تھوڑی دیر کے لئے تیز ہو گئی تھی کہ میں اپنا ہاتھ ہتھکڑی میں سے آزاد سکتا ہوں۔ خلیل میرے پاس ہی دروازے کے ساتھ سر لگائے آنکھیں بند کئے ٹرین کے ہچکولوں کے ساتھ ہل رہا تھا۔ شاید وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں فرار کے منصوبے بیدار ہونے لگے۔ ٹرین کے ڈبے سے فرار ہونے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ میں اگر ہتھکڑی میں سے اپنا ہاتھ نکال سکتا تھا تو چلتی ٹرین میں سے باہر کود جاؤں۔ کیونکہ ڈبے کے دروازے کو اگرچہ تالا لگا دیا گیا تھا مگر ہوا کی آمدورفت کے لئے اس کی کھڑکی کھلی تھی۔

لیکن چلتی ٹرین میں سے باہر چھلانگ لگانے کے بعد میرے زندہ بچنے کے صرف ایک فیصد امکانات تھے۔ ننانوے فیصد یہی امکان تھا کہ میں نیچے گرتے ہی یا تو ٹرین کے نیچے آ جاؤں گا یا کسی گڑھے میں یا پتھروں پر گرنے کے بعد میری ساری ہڈیاں چور ہو جائیں گی اور میں مر جاؤں گا۔ پہلے ٹرین کے ہچکولوں کی وجہ سے مجھ پر بھی خلیل کی طرح غنودگی طاری ہو رہی تھی لیکن ہتھکڑی میں سے ہاتھ باہر نکلنے کے بعد میری نیند غائب ہو گئی تھی۔ میرا دماغ گرم ہو گیا تھا اور بڑی تیزی سے فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا۔ ٹرین سٹیشن پر کھڑی ہونے کی صورت میں میرا فرار ہونا ناممکن تھا۔ ڈبے میں پولیس کے جتنے سپاہی سفر کر رہے تھے سارے کے سارے مسلح تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ ایک کانسٹیبل کے پاس برین گن تھی۔ صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ٹرین میں سے باہر کود جاؤں اور وہ بھی چلتی ٹرین میں سے۔ میں نے ٹرین کے باہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو آوازیں آرہی تھیں ان پر کان لگا دیئے۔ کبھی آواز آتی جیسے درختوں کی قطاریں شاں شاں کرتی پیچھے کو جا رہی ہوں۔ کسی وقت ایسی آواز آتی جیسے ٹرین کسی ندی نالے کے پل پر سے گزر رہی ہو۔ یہ اونچانیچا نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ میدان بھی آجاتے تھے مگر کھڈے کھائیاں اور ندی نالے بھی بہت تھے۔ اگر میں سیٹ پر بیٹھا ہوتا تو کم از کم باہر یہ ضرور دیکھ سکتا تھا کہ ٹرین پتھریلے علاقے سے گزر رہی ہے یا کھیتوں میں سے گزر رہی ہے۔ اس حالت میں میں جھاڑیاں دیکھ کر اندازے سے اس طرح چھلانگ لگا سکتا تھا کہ جھاڑیوں پر گروں اور میری ہڈیاں محفوظ رہیں۔ مگر ہم دونوں کو دروازے کے پاس فرش پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ایک سپاہی ہمارے ساتھ ہی سیٹ پر بیڑی پی رہا تھا۔

گاڑی رات کے وقت کسی بڑے شہر کے سٹیشن پر رکی۔ پولیس والوں نے کھانا منگوا لیا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے جو کچھ بچا تھا ہمارے آگے ڈال دیا۔ میں نے جھوٹے کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ خلیل نے بھی یہ کہہ کر کہ مجھے بھوک نہیں ہے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

ٹرین چلی تو میں نے خلیل کے ذرا قریب ہو کر اس سے پوچھا۔

"آگے کونسا سٹیشن ہے؟"

کانسٹیبل جو ہمارے قریب ہی سیٹ پر بیٹھا تھا اس نے ہمیں گالی دی کر زنجیر کو کھینچ کر کہا۔

"خبردار جو بات کی۔ خاموش بیٹھے رہو۔"

میں چپ ہو گیا۔ میں نے سر نیچے کر لیا۔ ٹرین کے باہر اندھیرا تھا۔ میں ذرا سا سر اونچا کر کے باہر دیکھ سکتا تھا۔ مگر اب رات ہو گئی تھی۔ آسمان پر چاند بھی نہیں تھا۔ بہت تاریکی تھی۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ ڈبے میں مدھم مدھم بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ پولیس والے ادھر ادھر لیٹ گئے تھے۔

ہمارے ساتھ والی سیٹ پر جو کانسٹیبل ہماری نگرانی کے لئے رائفل گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا وہ بھی اونگھنے لگا تھا۔ اس کا سر بار بار گھٹنوں تک آتا۔ وہ ایک جھٹکا سا کھاتا اور جلدی سے سر اوپر کر لیتا۔ اسے کے بعد پھر اونگھنے لگتا۔ ٹرین کا شور کافی تھا۔ میں نے خلیل کے ساتھ گردن لگا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"میں کھڑکی میں سے چھلانگ لگانا چاہتا ہوں مجھے بتاؤ آگے کوئی دریا آتا ہے؟"

میرا پروگرام یہ تھا کہ جس وقت گاڑی دریا کے پل پر سے گزر رہی ہو تو چھلانگ لگا دوں۔ کیونکہ میں دریا میں گرنے کی صورت میں ہی زندہ بچ سکتا تھا۔ یا کم از کم میرے زندہ بچنے کی پوری امید تھی۔ خلیل نے حیران ہو کر پہلے پولیس کے سپاہی کی طرف دیکھا جس کا سر چھاتی کے ساتھ لگا ہوا تھا اور وہ سو رہا تھا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ جو کچھ میں نے اسے کہا ہے اس پر اسے یقین نہیں آ رہا۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"میں ہتھکڑی میں سے کلائی نکال لیتا ہوں اگر تم نکال سکتے ہو تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ دریا آئے گا تو میں کھڑکی میں سے باہر کود جاؤں گا۔"

خلیل پریشان ہو گیا تھا۔ ڈبے میں سارے پولیس والے سو چکے تھے۔ ہمارے اوپر جو کانسٹیبل پہرے پر تھا وہ بھی سر جھکائے سو رہا تھا۔ خلیل نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ غلطی مت کرنا۔ مارے جاؤ گے۔"

میں نے کہا: "تم مجھے بتاؤ کہ آگے کوئی دریا آتا ہے۔ یہ تمہارے بہار کے صوبے کا علاقہ ہے۔ تم کو ضرور معلوم ہو گا۔"

وہ کہنے لگا:۔ "آدھ گھنٹے بعد دریا آئے گا۔ مگر اس پل پر لوہے کے گارڈروں والا قینچی پل بنا ہوا ہے۔ تم باہر کودے تو لوہے کے ستونوں سے ٹکرا کر مرجاؤ گے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کانسٹیبل نے ایک لمبا خراٹا لے کر سر اوپر اٹھالیا۔ ہم جلدی سے چپ ہو گئے۔ میں کنکھیوں سے کانسٹیبل کو دیکھ رہا تھا۔ کانسٹیبل نے نیند بھری نگاہوں سے ڈبے کا جائزہ لیا پھر ہماری طرف دیکھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سب خیریت ہے تو اس نے سیٹ پر نیم دراز ہو کر ٹانگیں پسار دیں اور سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کے شور میں اس کے خراٹوں کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ میں خلیل کے قریب ہو گیا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا:

"تمہارے خیال میں دریا کتنی دور ہو گا؟"

اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا: "رات کے وقت جب دریا قریب آنے والا ہوتا ہے تو پہلے تین چھوٹی ندیوں کے پل سے ٹرین گذرتی ہے۔ اس کے بعد دریا کا بڑا پل آجاتا ہے۔"

وہ چپ ہو گیا اور ڈبے میں سپاہیوں کا جائزہ لینے لگا جو سب لمبی تان کے بے سدھ سو رہے تھے۔ ہمارا پہرے دار کانسٹیبل بھی نیند میں غرق ہو چکا تھا۔ میں نے ہتھکڑی میں سے ہاتھ باہر نکالنے کی بھرپور کوشش کی۔ تھوڑی دیر بعد میرا ہاتھ ہتھکڑی میں سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنا آزاد ہاتھ خلیل کو دکھایا۔ وہ سرگوشی میں بولا:

"تمہارے فرار کے بعد مجھ پر مصیبت ضرور آئے گی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ اگر تم فرار ہو سکتے ہو تو ضرور فرار ہو جاؤ۔ مجھے خوشی ہو گی۔۔۔۔"

اتنے میں ٹرین کے کسی پل پر سے گزرنے کی خاص آواز سنائی دی۔ ٹرین جلدی سے پل پر سے گذر گئی تھی۔ خلیل نے سرگوشی میں کہا:

"ہوشیار ہو جاؤ۔ پہلی ندی گذر گئی ہے۔ دو چھوٹے پل اور آئیں گے۔"

میں نے ٹرین کی آواز پر کان لگا دیئے۔ جب گاڑی ایک ایک کر کے باقی دو ندیوں کے پلوں پر سے بھی گذر گئی تو میں نے ڈبے میں پولیس گارڈ کے آدمیوں کو غور

سے دیکھا۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ ہمارا کانسٹیبل بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ اتنے میں ٹرین بڑے پل پر سے گذرنے لگی۔ یہ ایک خاص آواز تھی۔ ٹرین کی رفتار دریا کے پل پر پہنچ کر ہلکی ہو گئی تھی۔ شاں شاں کی آواز کے ساتھ تھوڑی دیر کے بعد پل کی آہنی قینچیاں گذر جاتیں۔ دو آہنی قینچیوں کی آوازوں کے درمیان کوئی دس سیکنڈ کا وقفہ آتا تھا۔ بس مجھے اسی وقفے میں باہر چھلانگ لگانی تھی۔ کیونکہ اس وقت ٹرین اور دریا کے درمیان کوئی آہنی گارڈر حائل نہیں ہوتا تھا۔ پل کی چار پانچ قینچیاں گذر چکی تھیں۔ میرا دل دھڑک رہا تھا میں نے سیٹ پر نیم دراز کانسٹیبل پر نگاہ ڈالی۔ وہ سو رہا تھا۔ پل پر سے گذرنے کی ٹرین کی گڑگڑاہٹ نے بھی اسے بیدار نہیں کیا تھا۔ میں نے خلیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور آہستہ سے کہا:

"خدا حافظ دوست!"

خلیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بس میری طرف دیکھتا ہی رہا۔ میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈبے کے دروازے کی کھڑکی کھلی تھی جس میں سے ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر اندھیرا ضرور تھا مگر نیچے دریا کا سلیٹی رنگ کا پاٹ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میرے اور موت کے درمیان صرف ایک چھلانگ کا فاصلہ حائل تھا یا زندہ رہا یا مر گیا۔۔۔ لیکن میرے ساتھ دلی کی تہاڑ جیل میں جا کر جو دردناک اور وحشیانہ سلوک ہونے والا تھا اس سے ہزار درجے بہتر تھا کہ میں چلتی ٹرین سے دریا میں چھلانگ لگا دوں۔ اگر زندہ رہا تو ٹھیک ہے۔ مر گیا تو اس اذیت ناک اور موت سے بدتر زندگی سے تو نجات ملے گی۔

پل کے آہنی گارڈروں کی ایک قینچی تیزی سے پیچھے کی جانب گذر گئی۔ دوسری قینچی کے آنے میں چار پانچ سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ صرف پانچ سیکنڈ۔ ایک سیکنڈ اور گذر گیا۔ دوسرا سیکنڈ بھی گذر گیا۔ اور میں نے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیز ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے پیچھے کی طرف اچھال دیا اور پھر میں نیچے گرنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے جسم کو گیند کی طرح سمیٹ لیا۔ میں پانی میں گرا اور نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا۔ میں نے سانس روک رکھا تھا۔ پھر بھی ٹھنڈا پانی میری ناک میں گھس گیا۔ میرے کانوں میں بہتے دریا کے پانی کی گونج سنائی دینے لگی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور جلدی جلدی پاؤں اور ہاتھ ہلاتا اوپر آ گیا۔ دریا کی سطح پر آتے ہی میں نے دیکھا کہ ٹرین پل پار کر چکی تھی اور رات کے اندھیرے میں اس کے ڈبے کی آخری سرخ بتی آہستہ آہستہ تاریکی میں گم ہو رہی تھی۔

دریا کا بہاؤ بہت تیز تھا اور پانی کا دباؤ بھی بہت زیادہ تھا۔ میں ہاتھ پاؤں تیرنے کے انداز میں چلانے لگا۔ مگر دریا کی موجیں طوفانی رفتار سے مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہی تھیں۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ایک بار تو اندھیرے میں دریا کا وسیع پاٹ دیکھ کر میرے دل پر ہیبت طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے بہت جلد اپنے حواس پر قابو پا لیا اور آنکھیں بند کر کے دریا میں اس طرح تیرنے لگا کہ کنارے کی طرف چلا جاؤں۔ میں نے دریا کے وسط میں چھلانگ لگائی تھی۔ میں بائیں طرف جانے کی بجائے دائیں طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ بائیں طرف بنگال کا علاقہ تھا اور دائیں طرف دلی' پنجاب کا علاقہ آ جاتا تھا۔ میں بنگال کی طرف واپس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر دریا کا بہاؤ تیز نہ ہوتا تو میری پتلون اور جوتے میرے تیرنے میں بڑی رکاوٹ بنتے۔ مگر دریا تیز بہہ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے دائیں طرف جانے میں زیادہ دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں دریا کے وسط میں واقعی دریا کا پورا جلال نظر آتا ہے۔ ایک عجیب قسم کی ہیبت مجھ پر طاری ہو چکی تھی مگر میں جان بچانے کے خیال سے ہاتھ پاؤں چلاتا چلا جا رہا تھا۔ میری راہ میں درختوں کی کئی جھاڑیاں بھی آئیں۔ جیسے جیسے میں کنارے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا گھاس اور تنکے بہت زیادہ تعداد میں میرے آگے

آ رہے تھے۔ دریا کے اوپر اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ کچھ آسمان پر چمکتے ستاروں کی بھی ہلکی ہلکی روشنی تھی اور کچھ دریا کی سفیدی بھی مجھے راستہ دکھا رہی تھی۔ آخر میں دریا کے کنارے پہنچنے پر کامیاب ہو گیا۔ کنارے پر اونچی گھاس اور سرکنڈے تھے۔ زمین دلدلی تھی۔ میں کیچڑ میں سے گذر کر کنارے پر آ کر گر پڑا۔

دیر تک وہیں پڑا ہانپتا اور سانس ٹھیک کرتا رہا۔ میں تھک بھی گیا تھا اور میرے سارے کپڑے گیلے ہونے کی وجہ سے مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔ جب ذرا سانس ٹھیک ہوا تو میں اٹھ کر وہیں درختوں کے نیچے گھٹنے سینے کے ساتھ لگا کر بیٹھ گیا۔ میں سردی کی وجہ سے کپکپا رہا تھا۔ گھٹنے سینے کے ساتھ لگانے سے مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ اب میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کسی جگہ کوئی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی نظر نہ آئی۔ خدا جانے یہ کونسی جگہ تھی۔ اتنا مجھے احساس تھا کہ اتنے بڑے دریاؤں کے کنارے اور خاص طور پر ریلوے پل کے اردگرد آبادیاں ضرور ہوتی ہیں۔ مجھے ان آبادیوں کے لوگوں سے محفوظ بھی رہنا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ جیسے ہی پولیس کو معلوم ہوا کہ میں نے ریلوے پل پر سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی تو اس سارے علاقے کی پولیس کو خبردار کر دیا جائے گا اور پولیس کی پارٹیاں میری تلاش میں نکل پڑیں گی۔ اس لحاظ سے جتنی جلدی ہو سکے' مجھے اس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔

میں اٹھا اور دریا کے کنارے سے ہٹ کر درختوں میں ایک طرف چل پڑا۔ یہ کوئی پگڈنڈی یا کچا راستہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ اندھیرا بھی تھا۔ سانپ بچھو کا بھی ڈر لگا ہوا تھا۔ اس ڈر کے مارے میں بھاگنے لگا کہ میرے قدموں کی دھمک سے سانپ بچھو ادھر ادھر ہو جائیں گے۔ مگر میں بہت جلد تھک گیا۔ اندھیری رات میں مجھے درختوں کی جھاڑ جھنکاڑ کی جھلک سی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ ہم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شہروں کے رہنے والے اندھیرے کے عادی نہیں رہے۔ حقیقت یہ ہے اور تجربے نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ اندھیرے کی بھی اپنی ہلکی سی روشنی ہوتی ہے اور اندھیرا بھی مسافر کی راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اندھیرے کی روشنی کو صرف جنگلوں، بیابانوں میں زندگیاں بسر کرنے والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔

چلتے چلتے جھاڑیوں اور گھاسوں کا سلسلہ ختم ہوا تو مجھے کھیت نظر آئے۔ یہ کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان پر اندھیرے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کوئی نہ کوئی گاؤں یا قصبہ قریب ہی ہو گا۔ میں مغرب کی طرف جارہا تھا۔ کیونکہ اس طرف ہی بھارت کا مشرقی پنجاب اور بمبئی کے شہر تھے۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں مشرقی پنجاب کی طرف جانے کی بجائے دلی سے آگے بمبئی کی طرف نکلنے کی کوشش کروں اور پھر وہاں سے غیر ملکی جہازوں کے ملاحوں سے رابطہ پیدا کر کے بحری جہاز میں چھپ کے کراچی پہنچ جاؤں۔ کیونکہ ان حالات میں میرا بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنا قریباً ناممکن تھا جبکہ سرحدوں پر دونوں ملکوں کی فوجیں بیٹھی ہوں۔

میں کھیتوں کے درمیان مینڈھ پر چلا جارہا تھا۔ ایک جانب درختوں کے پیچھے کسی گاؤں کی روشنیاں پڑیں۔ مگر میں نے اس طرف جانا مناسب نہ سمجھا۔ میں اس علاقے سے کافی آگے کسی دوسرے شہر میں نکل جانا چاہتا تھا۔ ایک فکر مجھے یہ بھی لگی تھی کہ کل یا پرسوں اخباروں میں میری تصویر بھی چھپ سکتی ہے جس میں لکھا ہو گا کہ یہ پاکستانی جاسوس کی تصویر ہے جو آسنسول سے دلی آتے ہوئے دریا میں کود کر فرار ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے پکڑنے والے کو یا میری اطلاع دینے والے کو بھاری انعام بھی دیا جائے۔ میری تصویر جیل کے حکام نے آسنسول میں ہی اتار لی تھی۔ اخبار میں تصویر چھپ جانے سے میں کسی شہر میں بھی محفوظ نہیں تھا۔

چنانچہ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں شہروں کی طرف نہیں جاؤں گا۔ اس خیال سے بھی حوصلہ ملتا تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کی بھاری تعداد آباد تھی۔ مسلمان بھارت کے ہر صوبے میں رہتے تھے۔ یہ مسلمان میری مدد کر سکتے تھے۔ چلتے چلتے گاؤں کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں اور میں ایک کچی سڑک پر نکل آیا۔ اندھیرے میں مجھے سڑک کی دوسری جانب ایک جھونپڑی پر نظر پڑی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ جھونپڑی خالی ہوئی تو میں اس میں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کر لوں گا کیونکہ میرا جسم دریا کے ٹھنڈے پانی میں تیرتے رہنے کی وجہ سے اکڑنے لگا تھا۔ اوپر سے میرے کپڑے بھی گیلے ہو رہے تھے۔

میں سڑک پار کر کے جھونپڑی کے قریب آیا۔ جھونپڑی واقع خالی پڑی تھی۔ بھارت کے جنوبی اور جنوب مغربی اور جنوب مشرقی علاقوں میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور لوگ ڈھلوان چھتوں والی جھونپڑیاں کھیتوں میں بنا رکھتے ہیں۔ ان میں وہ رات کو اپنے مویشی باندھتے ہیں یا دھان وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ میں جھونپڑی میں گھس کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے قمیض اتار کر خشک ہونے کے لئے پتوں پر ڈال دی جس کا جھونپڑی میں ایک طرف ڈھیر لگا تھا۔ قمیض اتارنے سے مجھے سخت سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے گیلی قمیض دوبارہ پہن لی اور خشک پتوں کے ڈھیر میں گھس کر بیٹھ گیا۔ خشک پتوں نے میرے سرد جسم کو گرمائش پہنچائی۔ تھوڑی دیر بعد میری طبیعت بحال ہو گئی۔

اس علاقے میں میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ صبح ہوتے ہی یہ سارا علاقہ پولیس کی زد میں ہو گا اور مجھے دریا کنارے کے کھیتوں کھلیانوں میں تلاش کیا جارہا ہو گا۔ میں جھونپڑی سے نکل آیا اور کچے راستے پر چلنے لگا۔ آگے ایک ندی تھی۔ اس پر پل بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف کھلا میدان تھا۔ میدان میں کہیں کہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درختوں کے سیاہ جھنڈ لہرا رہے تھے۔ ان جھنڈوں کے قریب پہنچ کر سامنے آبادی کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی چھوٹا سا شہر ہے۔ میں آبادی کے باہر باہر سے ہو کر آگے نکلنا چاہتا تھا مگر آبادی کے مکان ختم نہیں ہو رہے تھے۔ کوئی نہ کوئی کالونی آجاتی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی چھوٹا شہر نہیں ہے۔ ایک جانب ریلوے سگنل کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس طرف سٹیشن تھا۔ میں دوسری طرف سے ہو کر ایک سڑک پر آگیا۔ اس سڑک پر سے دو ٹرک آگے پیچھے گزر گئے۔ دور نزدیک سڑک کی بعض اونچی عمارتوں پر نیون سائن کی بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔

مجھے قدم قدم پر خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس شہر سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری حالت بھی خستہ اور شکستہ ہو رہی تھی۔ پولیس مجھے آوارہ گرد سمجھ کر پکڑ کر لے جا سکتی تھی۔ کس وقت پولیس کو میرے فرار ہونے کا پتہ چلا ہو گا؟ وہ لوگ کسی دوسری گاڑی میں پچھلے سٹیشن کی طرف اٹھ دوڑے ہوں گے۔ وہ یہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کھڑکی میں سے کود کر فرار ہوا ہوں۔ اب پولیس کو صبح ہوتے ہی اس سارے علاقے کو محاصرے میں لے کر کھیتوں اور گاؤں میں جگہ جگہ ڈھونڈھنا تھا۔

میں سڑک سے تھوڑا اتر کر کچے راستے پر چل رہا تھا۔ ایک میدان میں کوئی سرکس لگا ہوا تھا۔ یہاں کافی روشنیاں تھیں مگر سرکس کے لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں یہاں سے بھی آگے نکل گیا۔ میری ٹانگیں چلتے چلتے تھک گئی تھیں۔ ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کونسا شہر ہے۔ آگے پھر ایک بازار آگیا۔ دکانیں بند تھیں۔ ایک دکان کے باہر انگریزی میں دکان کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پڑھا۔ وہ کوئی ساڑھی ہاؤس تھا۔ نیچے رام بازار دھنباد لکھا تھا۔ یہ دھنباد شہر

تھا۔ اچانک ایک طرف سے چوکیدار نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا بانس تھا۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کون ہو بھیا؟ یہاں کیا کر رہے ہو اتنی رات گئے؟"

میں نے کہا۔

"بھائی ریل میں آگے جا رہا تھا۔ دھنباد کے سٹیشن پہ گاڑی رکی۔ کچھ کھانے پینے کے لئے اترا۔ اتنے میں ٹرین چل پڑی۔ سوچا شہر چل کر کسی سرائے میں رات بسر کرتا ہوں۔ صبح دوسری گاڑی پکڑ لوں گا۔"

چوکیدار بولا۔

"بھیا یہاں آج کل سرائے کہاں ہوگی۔ تم سٹیشن پر جا کر رات بسر کر لو۔ جاؤ ادھر تمہیں کوئی جگہ نہیں ملے گی۔"

میں خاموشی سے واپس چل پڑا۔ کھیتوں میں چلنے کے بعد آگے اونچی زمین تھی۔ بند سا بنا ہوا تھا۔ میں اس کے اوپر چڑھا تو یہ ریلوے لائن تھی۔ بائیں طرف نگاہ ڈالی تو دور دھنباد سٹیشن کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر مجھے ریل کی ایک بوگی نظر آئی۔ رات گزارنے کے لئے مجھے یہ جگہ بڑی محفوظ نظر آئی۔ یہاں ڈبل لائن تھی۔ جس لائن پر ریلوے بوگی کھڑی تھی وہ اس ڈبل لائن والے ٹریک سے نکل کر ایک طرف جا کر آگے بند ہو گئی تھی۔ ریلوے کی بوگی خالی پڑی تھی۔ یہ تھرڈ کلاس کی بوگی تھی۔

میں اندر آتے ہی اوپر ایک برتھ پر چڑھ گیا۔ مجھے بے حد اطمینان کا احساس ہوا۔ ڈبے کی بند فضا نے جیسے مجھے اپنی نیم گرم آغوش میں لے لیا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ میں وہاں آیا ہی سونے کے واسطے تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ اب قدرت نے میرے ساتھ عجیب ستم ظریفی کی۔ میں اسقدر تھک گیا تھا کہ سویا تو کسی چیز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی ہوش نہ رہی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو گیا۔ جس وقت آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرا منہ برتھ پر ریل کے ڈبے کی دیوار کی طرف ہے۔ مجھے ریل کی پٹریوں کی کھٹاکھٹ کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ جس ڈبے میں سویا ہوا ہوں اسے شنٹ کرتا ہوا کوئی انجن سٹیشن کی طرف کسی گاڑی کے ساتھ جوڑنے لئے جارہا ہے۔ لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ڈبہ بڑی تیز رفتاری سے ریلوے لائن پر جارہا تھا۔ مجھے نیچے کچھ مسافروں کے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا ہے۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ٹرین پوری رفتار سے بھاگتی چلی جارہی ہے۔ سب سے پہلے جس اندیشے نے میرا حلق خوف کے مارے خشک کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ کہیں یہ گاڑی واپس آسنسول کی طرف تو نہیں جارہی۔ میں نے برتھ پر سے نیچے والی کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ ٹرین اس طرف جارہی تھی جس طرف میں جارہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ گاڑی کس طرف جارہی ہے۔ ایسا ہوا تھا کہ جس ڈبے میں میں سو رہا تھا اس ڈبے کی پوری بوگی کو کسی مسافر ٹرین کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہوا کہ ڈبے میں میں اکیلا کہاں سے آگیا ہوں۔ ریلوے کے آدمیوں کو بھی میں نظر نہ آیا۔ حالانکہ کسی بھی ڈبے کو جب شنٹ کر کے کسی ریل گاڑی کے ساتھ لگانے کے لئے لایا جاتا ہے تو ریلوے کے ملازم اس کی پوری طرح تلاشی لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اندھیرے میں انہوں نے لیمپ کی روشنی اندر ڈالی ہو مگر میں اوپر برتھ پر ہونے کی وجہ سے دکھائی نہ دیا ہوا ہوں۔ میرا لباس ایسا گندا ہو رہا تھا کہ میں شکل سے کوئی مزدور ٹائپ کا آدمی لگتا تھا۔ میں اوپر برتھ پر ہی خاموشی سے پڑا رہا۔

کسی سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ یہ گاڑی کس طرف جارہی ہے۔ میرا خیال ہے دن کے دس گیارہ بجے کا ٹائم ہو گا۔ اتنے میں نیچے سے ایک مسافر نے مجھے آواز دے کر کہا۔

"بھیا! تم اتنی دیر سے سو رہے ہو۔ کیا پیٹ پوجا نہیں کرو گے؟ آگے مرزا پور کا سٹیشن آ رہا ہے کوئی ناشتہ وغیرہ کر لو۔ نیچے آ جاؤ میرے ساتھ کچھ کھا پی لو۔ پوڑیاں بھی ہیں۔ گھر کے بنائے ہوئے لڈو بھی ہیں۔"

سوچا کہ یہ لوگ جس طرح کہتے ہیں مجھے اسی طرح کرنا چاہیے۔ یہ مجھے مسافر سمجھ رہے ہیں۔ اتنا ہی بہت ہے۔ میں جلدی سے برتھ سے نیچے اتر آیا۔ مجھے ایک ہندو لالہ نے کھانے کی دعوت دی تھی۔ اس کے سر پر ہندوؤں والی کالی ٹوپی تھی۔ دھوتی کرتے میں تھا۔ اس کی موٹی بیوی بھی ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ انہوں نے ایک ڈبہ کھول رکھا تھا۔ تھالی میں کچھ لڈو پوریاں پڑی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ان کے آگے ہندو بن جانا ہی مناسب رہے گا۔

میں نے نیچے اترتے ہی انہیں ہندوؤں کی طرح پرنام کیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دوسرے مسافروں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ لالہ جی نے میرے آگے پوڑیاں اور لڈو رکھتے ہوئے کہا۔

"بھیا تم کہاں جارہے ہو۔ اتنا تو ہمیں معلوم ہے کہ جب دھنباد سے ہم ڈبے میں چڑھے تو تم برتھ پر سو رہے تھے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں لالہ جی! اس خیال سے کہ شاید رش زیادہ نہ ہو میں رات کو ہی ڈبے میں آکر سو گیا تھا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا اچھا! ہاں بھیا جب سے بنگلہ دیش بنا ہے اس علاقے میں بہاریوں کا بڑا رش ہو گیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تم بہاری تو نہیں؟ مگر تمہاری بولی بہاریوں والی نہیں ہے؟"

یہ شخص بڑا باتونی لگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں لالہ جی! میں تو امرتسر کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام وجے لال ہے۔ دھنباد کام کی تلاش میں آیا تھا۔ کام نہیں ملا۔ اب امرتسر واپس جا رہا ہوں اپنے ماتا پتا کے پاس۔۔۔"

لالہ جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مگر یہ گاڑی تو الہ آباد جا رہی ہے۔ امرتسر جانا تھا تو بھیا دھنباد سے وارانسی جانے والی گاڑی پکڑتے۔"

دوسرے مسافر بھی میرے طرف دیکھنے لگے۔ ان سب کے چہرے بتا رہے تھے کہ انہیں میرے غلط ٹرین پکڑنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے تعجب سے باہر کھیتوں پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"تو کیا یہ ٹرین امرتسر نہیں جائے گی؟"

لالہ جی کی موٹی بیوی ساڑھی کا پلو منہ کے آگے کئے میری حماقت پر مسکرا رہی تھی۔ لالہ جی نے کہا۔

"بھیا یہ ٹرین تو الہ باد کان پور آگرہ سے ہوتی ہوئی دلی جا رہی ہے۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بھیا وجے پرشاد۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟"

خدا کا شکر ہے کہ مجھے تھوڑی دیر بعد اپنا بتایا ہوا نام یاد تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"جی وجے لال۔"

"ہاں۔ تو بھیا وجے لال تم چنتا نہ کرو۔ ہم الہ باد جا رہے ہیں۔ ہم تمہیں وہاں سے اگلی گاڑی میں بٹھا دیں گے جو کان پور سے اپنا روٹ لکھنؤ کی طرف بدل لے گی اور لکھنؤ سے آگے بریلی شاہجہان پور سے ہوتی ہوئی تمہیں انبالہ جالندھر اور امرتسر پہنچا دے گی۔ لو یہ لڈو کھاؤ۔"

میں لالہ جی کی فیملی کے ساتھ گھل مل گیا۔ لیکن کسی بڑے شہر کا سٹیشن آتا تو میں کسی بہانے ادھر ادھر ہو جاتا۔ دوسرے روز صبح کے وقت گاڑی الہ باد پہنچ گئی۔ یہاں سے مجھے جالندھر امرتسر کی طرف تو جانا نہیں تھا۔ لالہ جی میرے لئے ٹکٹ لینے گئے تو میں وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیک دل لالہ جی بھی میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ میں سٹیشن کے اندر ہی رہا۔

میرا پروگرام بنگال اور وسطی بھارت کے علاقے سے نکل کر بمبئی پہنچنا تھا۔ بنگال دلی کا علاقہ میرے لئے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ بمبئی وہاں سے کافی دور تھا اور وہاں سے میں غائب ہو سکتا تھا۔ مگر میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ کھانا مجھے لالہ جی نے کھلا دیا تھا۔ میں نے بغیر ٹکٹ آگے سفر کرنے کا سوچ لیا تھا۔ ایک قلی سے بمبئی جانے والی گاڑی کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے بتایا۔

"یہاں سے بھوپال جانے والی ٹرین پکڑو۔ بھوپال سے تمہیں بمبئی ایکسپریس مل جائے گی۔۔۔"

قلی نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ بھوپال والی گاڑی کونسے پلیٹ فارم سے روانہ ہو گی۔ میں اس پلیٹ فارم پر آکر کونے میں ایک سٹال پر آکر بیٹھ گیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ بھوپال جانے والی گاڑی آ گئی۔ میں بغیر ٹکٹ اس کے تھرڈ کلاس والے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ یہ بھی بڑا لمبا سفر تھا۔ سارا رستہ مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ ٹکٹ چیکر آ گیا تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ مگر خدا کا شکر ہے بھوپال تک کوئی ٹکٹ چیکر ہمارے ڈبے میں نہ آیا۔ بھوپال گاڑی رات کے وقت پہنچی تھی۔

مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں سے مجھے گاڑی بھی بدلنی تھی اور بمبئی ایکسپریس پکڑنی تھی۔ بھوپال میں مجھے مسلمانوں کا کلچر اور ثقافت نمایاں طور پر نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ کسی مسلمان بزرگ سے کچھ پیسے ادھار پکڑ لیتا ہوں۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ وہاں کئی مسلمان آ جا رہے تھے۔ میری نگاہ ایک بزرگ پر پڑی جنہوں نے اچکن پہنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی تھی اور وہ قلی سے سامان ٹریلر پر رکھوا رہے تھے۔ خشخشی شرعی ڈاڑھی تھی جس میں سفید بال کثرت سے اگے ہوئے تھے۔ سر پر مخمل کی ٹوپی تھی۔ خاص بھوپال کے لگ رہے تھے۔ قلی ٹریلر پر سامان رکھ رہا تھا۔ وہ بزرگ قریب کھڑے چھڑی سے سامان گن رہے تھے۔ میں نے ان کے قریب جا کر سلام کیا تو انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر وعلیکم سلام کہا اور سامان کے نگ گننے میں مصروف رہے۔

سامان گننے کے بعد انہوں نے میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میری حالت بالکل فقیروں والی ہو رہی تھی۔ کہنے لگے۔

"بیٹا! بھیک مانگنا کوئی اچھی بات نہیں۔ تم نوجوان ہو کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

انہوں نے مجھے فقیر سمجھا تھا۔ میں نے کہا۔

"جی کوئی کام نہیں ملتا۔ آپ مجھے پانچ سات روپے دے دیجئے۔ میں بمبئی جا کر کوئی کام تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"بمبئی ہی کیوں؟ بھوپال کیوں نہیں۔ جب نوکری کرنی ہے تو بمبئی میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ میرے ساتھ چلو میں تمہیں نوکری دلاتا ہوں۔ چلو آؤ۔"

میں نے سوچا کہ اس آدمی کے ساتھ چلے چلتا ہوں۔ یہ مسلمان نیک بزرگ ہے۔ اگر مناسب معلوم ہوا تو اسے ساری داستان بیان کر دوں گا۔ بہت ممکن ہے یہ آدمی مجھے بمبئی میں کسی بحری جہاز پر بٹھا سکے۔ آدمی اثر و رسوخ والا ہے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔ مجھے منظور ہے۔ مگر میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ میں ٹرین میں الہ باد سے بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔"

بزرگ کہنے لگے: "کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ آ جاؤ۔"

گیٹ پر ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ اس نے بزرگ کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب سے پرنام کیا۔ بزرگ نے اس کی خیریت پوچھی اور میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میرا نیا ملازم ہے۔ مجھے لینے آیا تھا۔"

سامان کا ٹریلر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے بعد میں بھی صاحب کے ہمراہ بھوپال سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ باہر ایک رئیسی تانگہ کھڑا تھا۔ سائیس نے آگے بڑھ کر جھک کر انہیں سلام کیا اور کہا۔

"حضور سامان دوسرے تانگے میں رکھوا کر کوٹھی بھجوا دیا ہے۔"

"شاباش۔ چلو اب ہمیں بھی گھر پہنچا دو۔"

خان صاحب تانگے میں اکیلے پیچھے بیٹھ گئے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھنے لگا تو وہ بولے: "نہیں، نہیں۔ آگے سائیس کے پاس بیٹھو۔"

میں سائیس یعنی کوچوان کے پاس بیٹھ گیا۔ بھوپال شہر کو میں نے ٹرین میں سے گزرتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ اب اس کے بازاروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا۔ خان صاحب کی پرانی نیم شکستہ کوٹھی شہر سے باہر ایک کارخانے کے عقب میں واقع تھی۔ وہاں پہلے سے دو تین نوکر خان صاحب کا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ انہوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے خان صاحب کو مغلیہ درباریوں کی طرح جھک کر آداب کیا اور میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھنے لگے۔ خان صاحب نے کہا۔

"یہ نیا ملازم رکھا ہے۔ اس کو کچن میں لے جا کر کام سمجھا دو۔"

میں اس خیال سے پریشان تھا کہ بھوپال ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں دلی کلکتے کے اخبار ضرور آتے ہوں گے۔ اگر ان اخباروں میں میری تصویر چھپ گئی تو بہت ممکن ہے یہ خان صاحب ہی مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں۔ میں ان سے بمبئی جانے کا کرایہ بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ اوپر سے مجھے سخت بھوک لگی تھی۔

ان سب باتوں سے مجبور ہو کر میں ان کے خاص آدمی کے ساتھ کچن کی طرف چل دیا۔ یہی سوچا کہ کسی طرح یہاں وقت تو گزر جائے گا۔ رات کو دیکھا جائے گا۔ کچن میں باورچی نے مجھے کھانا کھلایا۔ کیونکہ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے کہا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ اس نے مجھے چائے کی پیالی بھی بنا کر دی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس شہر سے آیا ہوں۔ میں نے جھوٹ موٹ ایک دردناک کہانی سنا دی۔ کھانا کھا کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ رات کو میں باورچی خانے میں برتن دھو رہا تھا کہ نوکر نے آ کر کہا۔

"تمہیں خان صاحب بلاتے ہیں۔ چلو۔"

خان صاحب اپنے کمرے میں گاؤ تکیہ لگائے دیوان پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

"یہاں آؤ میاں یہاں بیٹھو۔"

میں ان کے سامنے قالین کے فرش پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے نوکر کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ نوکر چلا گیا تو میری طرف دیکھ کر بولے۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم امرتسر کے رہنے والے پنجابی مسلمان ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں امرتسر میں کوئی پنجابی گھرانا آباد نہیں ہے۔ سچ سچ بتاؤ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

میں کشمکش میں پڑ گیا۔ کیا میں انہیں حقیقت بتا دوں؟ خان صاحب اپنے رویے اور شکل صورت سے مدبر اور شفیق آدمی لگتے تھے۔ پھر خیال آیا کہ کوئی پتہ نہیں یہ پولیس کے ڈر سے یا اپنی شہرت کو بدنامی سے بچانے کے واسطے مجھے پکڑوا دیں۔ ڈرا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"بات یہ ہے خان صاحب کہ ہم اصل میں مالیرکوٹلہ کے رہنے والے پنجابی ہیں۔ میرے والد صاحب امرتسر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ گھر میں مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا دوسرے شہر میں جا کر کام تلاش کرتا ہوں۔"

خان صاحب اس دوران مجھے بڑے غور سے دیکھتے اور تھوڑا مسکراتے رہے۔ پھر انہوں نے گاؤ تکیے کے نیچے رکھا ہوا اخبار نکال کر کھولا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ یہ تمہاری ہی تصویر ہے ناں؟"

میرے پاؤں تلے سے جیسے زمین ہی کھسک گئی۔ اخبار اردو کا تھا۔ اس میں ایک طرف چوکھٹے میں میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ نیچے وہی عبارت لکھی تھی کہ یہ پاکستانی جاسوس کی تصویر ہے۔ اس مفرور قیدی کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے یا اس کے بارے میں کوئی اطلاع دینے والے کو پولیس کی طرف سے بھاری انعام ملے گا۔ اب میں خان صاحب سے کچھ نہیں چھپا سکتا تھا۔ خان صاحب نے اخبار مجھ سے لے لیا۔ اسے تہہ کیا اور دوبارہ گاؤ تکیے کے نیچے رکھ لیا اور حقے کا کش لگا کر بولے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ اخبار یہاں شام کو چھپتا ہے۔ اس وقت سارے بھوپال شہر میں لوگوں نے تمہاری شکل دیکھ لی ہے اور یہاں کے ہندو انعام کے لالچ میں تمہاری تلاش میں ہوں گے۔"

میں گھبرا گیا تھا۔ میں نے خان صاحب کو اول سے لے کر آخر تک اپنی ساری کہانی بیان کر دی۔ وہ بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ جب میں نے اپنی داستان ختم کی تو کہنے لگے۔

"میرے نوکروں نے بھی تمہیں دیکھ لیا ہے۔ اب میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ ان نوکروں میں سے کسی نے بھی جاکر پولیس کو بتادیا تو میری خاندانی ساکھ کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ میں مسلمان ہوں اور مجھے سقوط ڈھاکہ کا یہاں کے دوسرے مسلمانوں کی طرح سخت صدمہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ مجھے یہاں سے بمبئی جانے والی گاڑی میں بٹھا دیں۔ میں بمبئی جانا چاہتا ہوں۔ وہاں سے میں کسی مال بردار جہاز میں سوار ہو کر کراچی پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

خان صاحب نے کہا۔

"تم شاید یہ نہیں جانتے کہ اس وقت پاکستان اور بھارت جنگ کی حالت میں ہیں۔ دونوں ملکوں کی ہوائی اور بحری سروس بند ہو چکی ہے۔ بمبئی سے تمہیں کونسا مال بردار یا مسافر جہاز مل سکے گا۔ یہ ناممکن ہے۔"

میں نے مایوس ہو کر کہا۔

"تو پھر آپ مجھے بمبئی جانے کا کرایہ دے دیجئے۔ میں بمبئی پہنچ کر پاکستان پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر پاکستان نہ جا سکا تو کسی جہاز میں بیٹھ کر دوبئی جانے کی کوشش کروں گا۔ دوبئی پہنچ گیا تو پاکستان جانا آسان ہو گا۔"

خان صاحب کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے:

"اس وقت رات ہونے والی ہے۔ بھوپال سے بمبئی کی طرف ایک گاڑی رات کے پونے گیارہ بجے چھوٹتی ہے۔ میں تمہیں کچھ روپے دیتا ہوں۔ تم یہاں سے نکل جاؤ۔"

اس کے بعد وہ اٹھے۔ الماری کھول کر اس میں سے بٹوہ نکالا۔ بٹوے میں سے دس دس روپے کے چار نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"یہ تمہارے لئے کافی ہوں گے۔ میں اس سے زیادہ تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ہم اب صرف نام کے نواب رہ گئے ہیں۔"

میں نے انڈین کرنسی کے نوٹ لے کر ان کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر جانے لگا تو انہوں نے مجھے روک لیا۔

"ٹھہرو۔ تم پہلے کبھی بمبئی گئے ہو؟"

میں نے کہا:۔ "بہت پہلے صرف ایک بار گیا تھا۔"

خان صاحب بولے:۔ "بمبئی میں ایک علاقہ ہے جس کا نام اندھیری ہے۔ کیا یہ نام تمہیں یاد رہے گا؟ میں اپنے ہاتھ سے ایڈریس لکھ کر تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر تم پکڑے گئے تو میرے ہاتھ سے لکھا ہوا ایڈریس میرے لئے مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا:۔ "جی مجھے اندھیری نام یاد رہے گا۔"

خان صاحب نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اندھیری کے علاقے میں ایک سڑک ہے جس کا نام کالج روڈ ہے۔اس روڈ کا نام کا بھی ذہن میں بٹھالو۔ کالج روڈ پر پہنچ کر تم کسی دکاندار یا ایرانی ہوٹل والے سے صوفی عبداللہ کا پوچھ لینا۔ وہ تمہیں صوفی صاحب کا پتہ بتادے گا۔ صوفی صاحب میرے پرانے دوست ہیں۔انہیں ساری بات بیان کر دینا۔وہ تمہارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔اب خاموشی سے سٹیشن کی طرف نکل جاؤ۔"

میں خان صاحب کا دوبارہ شکریہ ادا کر کے ان کے پرانے مکان کی پچھلی جانب سے سڑک پر نکل آیا۔ رات کا وقت تھا۔ سڑک پر کہیں کہیں روشنی تھی۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مجھے چوک میں ایک رکشہ مل گیا۔میں اس پر بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ہر قدم پر خطرہ تھا۔ سٹیشن پر میں اندھیرے میں لوگوں سے چھپتا چھپاتا ٹکٹ والی کھڑکی پر آیا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر سر پر باندھ لیا تاکہ کچھ شکل تبدیل ہو جائے۔ بمبئی کا ٹکٹ خرید کر میں پلیٹ فارم پر آکر آخر میں جدھر اندھیرا تھا۔ ایک خالی بینچ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

اخبار میں چھپی ہوئی تصویر نے مجھے بے حد پریشان کر دیا تھا۔جس اخبار میں میری تصویر چھپی ہوئی تھی وہ بھوپال شہر کا کوئی غیر معروف سا مقامی اخبار لگتا تھا۔مگر میں سوچتا کہ ہو سکتا ہے یہ اخبار بمبئی میں بھی جاتا ہو۔ جتنی دیر تک گاڑی نہیں آئی۔ میں انتہائی ذہنی کرب کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ٹرین آکر رک گئی۔میں ٹرین کے ان ڈبوں کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا جو سٹیشن کے بارونق سٹالوں کے آگے رکے تھے اور جہاں مسافروں کی ریل پیل تھی۔ میں ٹرین کے آخری ڈبے میں گھس گیا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔اکثر سو رہے تھے۔ جگہ کوئی نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس ہی فرش پر سر گھٹنوں میں کر کے اس طرح بیٹھ گیا جیسے سونے کی کوشش کر رہا ہوں۔

جب تک ٹرین بھوپال سٹیشن پر کھڑی رہی میری جان سخت عذاب میں پھنسی رہی۔ خدا خدا کر کے گارڈ اور انجن کی سیٹیوں کی دو تین آوازیں بلند ہوئیں اور ٹرین ایک دھچکے کے ساتھ بمبئی کی طرف روانہ ہو گئی۔جب تک ٹرین بھوپال سے کافی دور نہیں نکل گئی۔ میں نے سر نہیں اٹھایا۔ پھر میں نے مسافروں کا جائزہ لیا۔ تقریباً آدھے سے زیادہ سو رہے تھے۔جو جاگ رہے تھے وہ بھی سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔میں بیان نہیں کر سکتا کہ بھوپال سے بمبئی تک کا طویل سفر میں نے کس قدر ذہنی اذیت برداشت کرتے ہوئے طے کیا۔

خدا خدا کر کے ٹرین بمبئی کے مضافات میں داخل ہوئی اور بمبئی سٹیشن پر آ کر رک گئی۔ بمبئی سٹیشن پر کچھ بے فکری والا ماحول تھا۔ کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ بمبئی کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بھوپال اور الہ باد شہر والی سردی نہیں تھی۔ میں نے ایک خالی ٹیکسی والے سے کہا۔

"مجھے اندھیری جانا ہے۔ کتنا کرایہ ہو گا؟"

"بیٹھو بابو۔ کیا ہے کہ ہم اندھیری کا بیس روپے کرایہ لیتا ہے۔ تم سے اٹھارہ لے لے گا۔"

میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی بمبئی کے بارونق بازاروں میں سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ اندھیری کا علاقہ کافی دور تھا۔ ایک جگہ ریلوے لائن کا پھاٹک عبور کیا تو ٹیکسی دائیں جانب ایک سڑک پر آگئی جس کی دونوں جانب اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"مجھے کالج روڈ جانا ہے۔"

"یہی کالج روڈ ہے۔ آپ کو کس نمبر کی چالی میں جانا ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹیکسی سڑک کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور سڑک کے چھوٹے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ایک جگہ پان کی دکان تھی۔ میں نے دکاندار سے صوفی عبداللہ کے بارے میں پوچھا تو دکاندار پان لگاتے لگاتے رک گیا۔ پھر ذرا آگے ہو کر سڑک پر ایک طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

"سیدھا جائے گا۔ پھر الٹے باجو ہو جائے گا آگے پارسی بلڈنگ آئے گا۔ اس کی چالی میں صوفی جی رہتے ہیں۔"

میں آگے چل پڑا۔ جیسے جیسے دکاندار نے بتایا تھا ویسے ویسے میں چلتا ہوا ایک زرد رنگ کی بوسیدہ دو منزلہ عمارت کے سامنے آ کر رک گیا۔ عمارت کی پیشانی پر انگریزی میں پارسی بلڈنگ لکھا ہوا تھا۔ عمارت کے آگے کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک آدمی بلڈنگ کی کشادہ ڈیوڑھی کے پاس لوہے کی کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں نے اس سے صوفی صاحب کا پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"اوپر چلے جاؤ۔ گیلری میں آخری چالی صوفی صاحب کی ہے۔ ابھی ابھی اوپر گئے ہیں۔"

میں بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیلری میں آ گیا۔ یہاں ساتھ ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ کسی کمرے سے ہارمونیم کی آواز آ رہی تھی کسی سے بچے کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں ریڈیو بج رہا تھا۔ آخری کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے باہر دیکھا۔ دروازے پر صوفی صاحب کا نام لکھا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی کی بھاری آواز آئی۔

"اندر آ جاؤ بھائی۔ دروازہ کھلا ہے۔"

میں دروازے کو دھکیل کر اندر چلا گیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ ایک سرخ و سفید رنگت والا پختہ عمر کا آدمی بستر پر چوکڑی مار کر

بیٹھا تھا۔ سامنے ایک رجسٹر کھلا تھا جس پر وہ کچھ درج کر رہا تھا۔ مجھے تعجب سے دیکھا اور بولا:۔

"کون ہو میاں؟ کہاں سے آئے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے بھوپالوالے خان صاحب کا نام لے کر کہا۔

"مجھے خان صاحب نے آپ کے پاس ایک خاص کام کے لئے بھجوایا ہے"۔

"اوہو اوہو خان صاحب کیسے ہیں؟ یہاں بیٹھ برخوردار یہاں۔۔۔"

صوفی صاحب نے اخبار جلدی سے کرسی پر سے ہٹا دئے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔ "آپ ہی صوفی عبداللہ ہیں ناں؟"

صوفی صاحب مسکرائے:۔ "ہاں بھئی میرا نام ہی صوفی عبداللہ ہے۔ صوفی تو مجھے یونہی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے۔ میں تو گناہ گار آدمی ہوں۔ بولو کیا پیو گے۔ ٹھنڈا یا گرم؟"

انہوں نے مجھے چائے کا ایک گرم کپ دیا اور ایک خود لے لیا۔ کہنے لگے:۔ "برخوردار! اکیلا رہتا ہوں۔ تم بتاؤ۔ کیسے بمبئی آئے ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

خان صاحب نے مجھے کہا تھا کہ صوفی صاحب سے ساری بات کھل کر بیان کر دینا مگر میں کچھ ہچکچا رہا تھا۔ انہوں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن جھجک رہا ہوں۔ انہوں نے چائے کا کپ نیچے رکھ کر سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر پیکٹ میری طرف بڑھا دیا اور بولے:۔ "سگریٹ پیتے ہو تو لو پیو۔ بے فکر ہو کر پیو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے ایک سگریٹ لے لیا۔ صوفی صاحب نے میرا سگریٹ خود سلگایا اور مسکراتے ہوئے کہا:۔ "میاں لگتا ہے تم مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو مگر سوچ رہے ہو کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔"

میں نے کہا:۔ "جی ہاں آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ صوفی صاحب' میں بنگلہ دیش سے جان بچا کر بھارت آیا ہوں اور اب کسی طرح پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ کسی طرح خان صاحب، کے پاس بھوپال پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔"

صوفی صاحب کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ بڑی توجہ سے انہوں نے میرا بیان سنا۔ جب میں چپ ہو گیا تو وہ بولے:۔ "مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم بنگلہ دیش سے نکل کر کہاں کہاں پھرتے رہے۔ کیا کہیں پکڑے بھی گئے تھے؟ کیا پولیس والوں نے تمہاری تصویر بھی اتار لی تھی؟"

میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میں آسنسول کی جیل سے فرار ہوا تھا جہاں پولیس نے مجھے پکڑ کر قید میں ڈال رکھا تھا۔ وہاں میری تصویر اتاری گئی تھی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ بھوپال کے مقامی اخبار میں میری تصویر انعام کے اعلان کے ساتھ چھپ بھی چکی ہے۔

میں نے دیکھا کہ صوفی صاحب پر اسکا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ کہنے لگے:۔

"بھوپال کے مقامی اخبار کو کون جانتا ہے۔ اگر تمہاری تصویر دلی کلکتہ کے اخباروں میں بھی چھپی ہوگی تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہاں دلی کلکتے کے اخباروں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ بمبئی ایک بہت بڑا اور انٹرنیشنل قسم کا شہر ہے۔ یہ بتاؤ تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے بھی تمہیں خالی چائے ہی پلا دی ہے۔"

صوفی صاحب مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ جس طرح بھوپال والے خان صاحب میری تصویر دیکھ کر گھبرا گئے تھے اس طرح کا ردعمل صوفی صاحب نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح بے نیازی سے باتیں کر رہے تھے جیسے فکر کی کوئی بات ہی نہ ہو۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے تھپکی دی اور کہا۔

"تم بیٹھو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر صوفی صاحب کھولی سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کھولی میں اکیلا رہ گیا۔

دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ کہیں صوفی صاحب پولیس کو لینے تو نہیں گئے؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ صوفی صاحب درویش ٹائپ مسلمان ہیں۔ خان صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ پھر بھی میں کھولی سے باہر نکل کر گیلری میں آ گیا اور جھانک کر نیچے دیکھا۔ صوفی صاحب مجھے عمارت کی ڈیوڑھی سے نکل کر سڑک پر سامنے والے ریستوران میں جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مگر ستون کی آڑ میں کھڑا رہا اور صوفی صاحب پر نگاہ رکھی۔ سامنے چھوٹا سا ایرانی ہوٹل تھا۔ صوفی صاحب ہوٹل سے باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

میں جلدی سے کھولی میں آ کر بیٹھ گیا۔ صوفی صاحب میرے لئے بند مکھن لائے تھے۔ بند مکھن پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیا اور کہنے لگے۔

"میاں! یہاں سے تمہارا کسی مال بردار یا مسافر جہاز میں بیٹھ کر دوبئی وغیرہ فرار ہونا ناممکن ہے۔ میرے آدمی نے مجھے ساری صورتحال بتائی ہے۔ بمبئی سے لے کر اوپر پاکستان کے سمندر تک بھارت کی نیوی کے جہاز گشت لگا رہے ہیں۔ بمبئی کے ساحل سے کسی آدمی کو سمندر میں کھڑے کسی جہاز تک جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ

کہہ رہا تھا کہ میں مجبور ہوں۔ اگر دونوں ملکوں میں جنگ کی حالت نہ ہوتی تو یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا مگر اس وقت ناممکن ہے۔"

میں نے مایوسی کے عالم میں سر جھکایا اور دل میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کشمیر یا مشرقی پنجاب سے بارڈر کراس کرنا پڑے گا۔ حالانکہ ادھر سے سرحد پار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ ذرا سے کھٹکے پر دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی تھی۔

صوفی صاحب نے مجھے مایوس ہوتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے۔

"میاں، تم مایوس کس لئے ہوتے ہو۔ مایوسی گناہ ہے۔ میرا ایک اور جاننے والا ہے۔ میں کل اس سے بات کروں گا۔ وہ یہاں سے دور رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری مدد کرنے کو تیار ہو جائے۔"

میں صوفی صاحب کی طرف سے واقعی مایوس ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے اب بھارت کے شمال کی طرف یعنی مشرقی پنجاب کے جموں کے علاقے کی طرف بھاگنے کا سوچ رہا تھا۔ وہ رات میں نے صوفی صاحب کی کھولی میں پہلو بدل کر گزار دی۔ کبھی خیال آتا کہ میں جموں سیالکوٹ کا بارڈر کراس کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کبھی خیال آتا کہ ایسا نہ کر سکوں گا۔

دوسرے دن صوفی عبداللہ صاحب مجھے کمرے میں بٹھا کر اپنے دوسرے آدمی سے ملنے چلے گئے۔ کہنے لگے۔

"مجھے دیر لگے گی۔ گھبرانا بالکل نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا"۔

میں دوپہر تک صوفی صاحب کی کھولی میں پڑا رہا۔ جب تھک گیا تو اٹھ کر گیلری میں ٹہلنے لگا۔ بمبئی کی فضا کلکتہ دلی کے مقابلے میں واقعی ذرا مختلف تھی۔ یہاں لگتا تھا جیسے کوئی میری طرف توجہ ہی نہیں دے رہا اور میں کسی کی نظر میں نہیں ہوں۔ جس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلڈنگ میں صوفی صاحب کی کھولی تھی' اس میں زیادہ تر مراٹھی اور پارسی لوگ رہتے تھے۔ سہ پہر کے وقت صوفی صاحب نمودار ہوئے۔ میری جان میں جان آئی۔ وہ تھکے ہوئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے چائے بنائی۔ کہنے لگے۔

"پہلے چائے کی ایک پیالی پی لوں۔ پھر تم کو ساری بات بتاؤں گا۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ صوفی صاحب نے کیتلی میں بڑی کڑک قسم کی چائے بنائی۔ ایک گلاس میں مجھے دی اور ایک خود لے کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ گرم چائے کے دو ایک گھونٹ پی کر انہوں نے سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا کش لگانے کے بعد کہنے لگے۔ "میاں! یوں سمجھو تمہارا کام ہو گیا ہے۔"

میں نے پر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ بولے۔

"میں اپنے جس دوست سے ملنے گیا تھا اس کی کچھ سمگلروں سے گہری دوستی ہے۔ یہ سمگلر انڈیا پاکستان کی راجستھان کی سرحد پر اپنی مجرمانہ سرگرمیاں کیا کرتے ہیں۔ آج کل اگرچہ سارے بارڈر پر فوجیں بیٹھی ہیں لیکن میرے دوست کے کہنے کے مطابق صرف راجستھان کا صحرائی بارڈر ایسا ہے جہاں چند ایک مقام ایسے ہیں جہاں سے سمگلر رات کے اندھیرے میں خانہ بدوشوں کے بھیس میں موقع پا کر نکل آتے ہیں یا ادھر سے ادھر چلے جاتے ہیں۔ میں نے تمہاری بات پوری تفصیل کے ساتھ کی تھی۔ اس کے مطابق یہ ایک مشکل کام ہے مگر اس نے کہا کہ میں اس پاکستانی نوجوان کو راجستھان کا بارڈر ایک جگہ سے کراس کرا کر پاکستان کی سرحد پر پہنچا دوں گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ صوفی صاحب سگریٹ کا کش لگا کر کہنے لگے۔

"میاں! تمہارے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بمبئی شہر میں خطرناک حالات نہیں ہیں مگر تمہاری تصویر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ تم کسی وقت بھی پہچانے جا سکتے ہو اور پکڑے جا سکتے ہو۔ میں بھی تمہیں صاف

ہے۔ تم کسی وقت بھی پہچانے جا سکتے ہو اور پکڑے جا سکتے ہو۔ میں بھی تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ زیادہ دنوں تک تمہاری ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوں۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ میرے دوست کی پیش کش قبول کر لو اور اس کے ساتھ راجستھان پار کر کے اپنے ملک پاکستان چلے جاؤ۔ میرا دوست مسلمان ہے اور جے پور کا رہنے والا ہے۔ وہ تو بڑی رقم لے کر بارڈر کراس کراتا ہے۔ تم سے تو ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ یہ کام وہ صرف مسلمان اور میرا دوست ہونے کی وجہ سے کرنے کو راضی ہو گیا ہے۔
"

اس دوران میں بھی صورت حال کی نزاکت پر غور کرتا رہا۔ میں اکیلا سرحد پار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ایک تجربہ کار آدمی مجھے سرحد پار کرانے کو تیار ہو گیا ہے۔ مجھے اللہ کا نام لے کر اس ایڈونچر میں چھلانگ لگا دینی چاہیے۔ میں نے صوفی صاحب سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"

صوفی صاحب نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"میاں تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں خان صاحب مل گئے۔ اس کے بعد ان کی وساطت سے تمہاری مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ یہاں رہ کر تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے۔ تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"مجھے آپ کے دوست کے پاس کس وقت جانا ہو گا؟"

صوفی صاحب کہنے لگے۔

"میرے دوست نے مجھے آتی دفعہ کہا تھا کہ اگر پاکستانی نوجوان تیار ہو جائے تو اسے کل منہ اندھیرے میرے ڈیرے پر لے آنا۔ بس تم تیار رہو۔ آج رات کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پچھلے پہر تم میرے ساتھ نکل چلوگے۔ میرا ایک ٹیکسی ڈرائیور بڑا بھروسے کا آدمی ہے اور دوست بھی ہے۔ میں آج اسے کہہ دوں گا۔ وہ صبح صبح ہمیں یہاں سے لے کر فیروز بھائی کے ڈیرے پر پہنچادے گا۔"

فیروز بھائی ان کے اس دوست کا نام تھا جو مجھے بارڈر پار کرانے پر رضامند ہو گیا تھا۔ صوفی صاحب شام کو اپنے ٹیکسی ڈرائیور دوست کو جاکر کہہ آئے۔ رات بارہ بجے تک صوفی صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے ایک خاکی رنگ کی قمیض پہننے کو دی۔ میری قمیض چیتھڑا بن گئی ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔

"میں پتلون نہیں پہنتا ورنہ تمہیں ایک پتلون بھی پہننے کو دے دیتا۔ لیکن پتلون تمہاری ابھی تک ٹھیک حالت میں ہے۔"

پھر بولے:۔ "تم سو جاؤ۔ میں جاگتا رہوں گا۔"

میں وہیں صف پر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ صوفی صاحب قبلہ رو بیٹھے نفل پڑھ رہے ہیں۔ میں بڑے ادب کے ساتھ کھسک کر دیوار کے ساتھ ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میں سو گیا۔ صبح منہ اندھیرے صوفی صاحب نے مجھے جگادیا۔

"اٹھو میاں چلنے کی تیاری پکڑو۔ ٹیکسی والا آتا ہی ہو گا۔ وقت ہو گیا ہے"۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے وقت پوچھا۔ صوفی صاحب بولے۔

"میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔ میں نے آسمان پر ستاروں کا حساب رکھا ہوا ہے۔ میں نے ابھی ابھی آسمان پر نگاہ ڈالی تھی۔ ایک خاص ستارہ مشرقی افق پر طلوع ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ جلدی سے باتھ روم میں جاکر منہ دھولو۔"

میں گیلری میں سے ہوتا ہوا اس منزل کے مشترکہ باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو صوفی صاحب نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ انہوں نے ایک بند بھی کاٹ کر پلیٹ میں ڈالا ہوا تھا۔ ہم نے آدھا آدھا بند کھایا۔ چائے پی۔ وہ ابھی سگریٹ سلگا رہے تھے کہ نیچے گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔

"رحمت علی آ گیا ہے۔ یہ میرے ٹیکسی ڈرائیور دوست کا نام ہے۔"

انہوں نے گیلری میں سے جھانک کر دیکھا۔ واپس آکر بولے۔

"رحمت علی ہی ہے۔ جلدی سے نیچے آجاؤ اب۔"

میں ابھی کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ انہوں نے کمرے کا تالا لگایا۔ نیچے اتر کر سڑک پر آئے۔ ٹیکسی میں بیٹھے اور ٹیکسی رات کے پچھلے پہر بمبئی کے خالی کشادہ بازاروں پر چل پڑی۔ ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ مگر بمبئی شہر کی سڑکوں پر بتیاں روشن تھیں۔ اردگرد کی بلڈنگوں میں بھی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی تھی۔ میرے لئے سارے بازار، ساری سڑکیں اجنبی تھیں۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ٹیکسی کافی دیر تک چلتی رہی۔ پھر وہ ایک ایسے علاقے میں آگئی جہاں عمارتیں دور دور ہو گئی تھیں اور کہیں کھلا میدان آجاتا تھا۔ کہیں کارخانے شروع ہو جاتے تھے۔ آخر ٹیکسی ایک کارخانے کی طرف سڑک پر گھوم کر اس کی پچھلی جانب کواٹروں میں آکر رک گئی۔

یہاں ایک کواٹر میں صوفی صاحب کا دوست فیروز خان رہتا تھا۔ دبلا پتلا چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی۔ چھوٹی چھوٹی موچھیں تھیں۔ وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں کواٹر کے اندر کمرے میں لے گیا۔ صوفی صاحب سے بولا۔

"صوفی صاحب! ٹیکسی والے کو واپس بھیج دیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ باہر گئے اور ٹیکسی والے کو واپس بھجوا کر اندر آ گئے۔ انہوں نے فیروز بھائی سے میرا تعارف کرایا۔ فیروز بھائی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ذہانت کی چمک تھی جو مکاری اور عیاری سے ملتی جلتی تھی۔ کہنے لگا۔

"کیوں میاں! ریت کے صحراؤں میں بھوکے پیاسے سفر کر لو گے؟ وہاں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بارڈر فورس کی گولی لگنے سے ہلاک ہو جاؤ۔"

ایک بار تو اس نے مجھے ڈرا دیا۔ دل میں آیا کہہ دوں کہ میں بارڈر کراس نہیں کروں گا۔ مگر اب میں پھنس چکا تھا۔ یہ بھی سوچا کہ پکڑا تو بھارت کے کسی بھی شہر میں جا سکتا ہوں اور اس سے بہتر ہے کہ بارڈر کراس کرنے کی کوشش کر لوں۔ ہو سکتا ہے کامیاب بھی ہو جاؤں۔ میں نے کہا۔

"میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پاکستان پہنچنے کے لئے میں اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں۔"

فیروز بھائی صوفی صاحب کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"لڑکا بہادر ہے اور سچا پاکستانی ہے۔ پاکستان کو ایسے ہی محب وطن نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"صوفی صاحب! آپ دن نکلنے تک میرے کوارٹر میں ہی رہیں گے۔ میں نے کارخانے میں چار دن کی چھٹی کی عرضی بھجوا دی ہے۔ تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔ آپ دن نکلنے کے بعد کوارٹر کو تالا لگا کر چابی ساتھ ہی لے جائیے گا۔ واپس آ کر آپ سے لے لوں گا۔"

اس نے پتلون بوٹ پہلے سے ہی پہن رکھے تھے۔ گلے میں ریشمی مفلر ڈالا اور مجھ سے کہا۔

"چلو میاں۔۔۔ خدا کرے کہ تم پاکستان خیریت سے پہنچ جاؤ۔ امید تو ہے باقی اللہ مالک ہے۔"

صوفی صاحب نے مجھے گلے لگا کر دعا دی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں فیروز بھائی کے ساتھ کوارٹر سے نکل کر دوسری طرف چھوٹی گلیوں میں سے گزرتا ہوا ایک کھلی سڑک پر آ گیا۔ یہاں ایک پرانی جیپ کھڑی تھی۔ ڈرائیور اندر پہلے سے بیٹھا تھا۔ ہم جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے۔ فیروز نے جیپ کا پردہ گرا دیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"ٹونی بیٹا۔ لے چلو رانی کو۔"

جیپ کھلی سڑک پر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جیپ ایک روشنیوں والے علاقے میں ایک عمارت کے سامنے آ کر رک گئی۔ یہ کوئی ریلوے سٹیشن لگتا تھا مگر یہ بمبئی کا وہ ریلوے سٹیشن نہیں تھا جہاں میں گاڑی سے اترا تھا۔ فیروز نے یہاں سے جیپ واپس بھجوا دی اور مجھے ساتھ لے کر عمارت کی طرف بڑھا۔ مجھے دور سے انجن کے شنٹ کرنے اور وسل دینے کی آوازیں آئیں۔ فیروز بھائی بولا۔

"یہ باندرہ کا سٹیشن ہے۔ ہم یہاں سے بروڈہ سے ہوتے ہوئے جودھ پور جائیں گے۔"

میں نے جودھ پور کا نام سن رکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"ہم جودھ پور کس وقت پہنچیں گے؟"

فیروز نے کہا۔

"کل اسی وقت پہنچ جائیں گے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرے خدایا! میں پہلے ہی ریل کے لمبے سفر سے تنگ آیا ہوا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ میں خاموش رہا۔ فیروز نے جودھ پور کے دو ٹکٹ لئے اور ہم سٹیشن کے اندر آ گئے۔ پلیٹ فارم پر چند ایک مسافر ہی تھے۔ بروڑہ جانے والی گاڑی آدھے گھنٹے بعد تیار ہوئی۔ ہم تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔ بروڑہ سے ہم نے ٹرین بدلی اور جودھ پور جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب جو یہ سفر شروع ہوا تو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہرے بھرے سرسبز علاقے پیچھے رہ گئے۔ صحرائی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں کھیتوں کے ٹکڑے نظر آجاتے تھے۔ ریت کے ٹیلے بھی ٹرین سے کچھ فاصلے پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک دن گزر گیا۔ ایک رات گزر گئی۔ دوسرے دن شام کو ٹرین ایک صحرا میں سے گزر رہی تھی جہاں غروب ہوتے سورج کی گلابی روشنی ریت کے ذروں میں منعکس ہو کر صحرا کو روشن کر رہی تھی۔ ایسا منظر میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جیسے جیسے سورج صحرائی ٹیلوں کے پیچھے چھپتا گیا' یہ سنہری روشنی قرمزی ہوتے ہوتے شام کے سیاہ اندھیرے میں بدل گئی۔

میں نے فیروز بھائی سے کہا۔

"جودھ پور ابھی کتنی دور ہے؟"

وہ کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر بولا۔

"بس ایک گھنٹے میں ہم جودھ پور پہنچ جائیں گے۔"

ایک گھنٹے بعد ریت کے ٹیلے پیچھے رہ گئے۔ صحرا میں دور کہیں روشنیاں دکھائی دینا شروع ہو گئیں۔ ایک سڑک ریلوے لائن کے ساتھ نمودار ہو گئی۔ اس پر ایک فوجی کانوائے گزر رہا تھا۔ فیروز بھائی نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر کہا۔

"کہیں انڈیا پاکستان کی دوبارا جنگ تو نہیں شروع ہو گئی؟ اگر ایسی بات ہے تو ہمیں واپس جانا پڑے گا۔"

میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ فیروز بھائی کا اندازہ غلط نکلے۔ ہم جودھ پور پہنچ گئے۔ وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ معلوم ہوا سرحدوں پر کشیدگی ضرور ہے مگر جنگ بندی ہو چکی ہے۔"

جودھ پور میں فیروز شاہ مجھے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ اسکا تعلق بارڈر کے سمگلروں سے تھا۔ اسکا نام خیرو تھا۔ فیروز نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔ کافی تیز طرار آدمی لگتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے چاروں طرف آنکھیں گھما رہا تھا۔ فیروز بھائی نے اسے میرے بارے میں ساری بات بتادی۔ معلوم ہوا کہ وہ فیروز بھائی کا بڑا گہرا دوست تھا۔ کہنے لگا۔

" سرحدوں پر انڈیا نے اور فوج بھجوا دی ہے۔ کل سے مجھے یہی خبریں مل رہی ہیں۔ لیکن تم فکر نہ کرو میں اس لڑکے کو سرحد پار کرا دوں گا۔"

فیروز بھائی نے رات کو مجھے کہا۔ "میں صبح واپس بمبئی چلا جاؤں گا۔ خیرو کو بالکل اسی طرح سمجھنا جس طرح فیروز بھائی کو سمجھتے ہو۔ وہ تمہیں اپنی حفاظت میں سرحد پار کرا دے گا۔"

میں نے کچھ تشویش کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

"تمہیں کسی قسم کی تشویش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں جو کہہ دیا ہے ویسا ہی ہو گا۔ یہ میرا جگری دوست ہے۔ ہاں' سرحد پر تم لوگوں کو انڈیا کی فوج نہ پکڑ لے کیونکہ بارڈر فورس کی بجائے سرحد پر فوج آ گئی ہے۔"

میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنی مرضی منوا سکتا۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ فیروز بھائی کے پاس اتنے میں خیردین بھی آ گیا۔ ہم تینوں ایک کوٹھڑی میں بیٹھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے۔ بلب جل رہا تھا۔ خیردین عرف خیرو نے جیب سے پرانے کاغذ پر بنا ہوا نقشہ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اس پر آڑھی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں اور شہروں اور قصبوں کے نام ہندی میں لکھے ہوئے تھے جنہیں میں نہیں پڑھ سکتا تھا۔

فیروز اور خیردین نقشے پر جھک گئے۔

خیردین ایک جگہ انگلی رکھ کر کہنے لگا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ جودھپور ہے۔ ہم یہاں سے پہلے چھایا گڑھ والے بارڈر کی طرف سے بارڈر کراس کر کے مال لے جایا کرتے تھے۔ مگر اب یہاں فوج کے مورچے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے ہم نہیں گزر سکتے۔ اب بائیں جانب کے ریت کے ٹیلوں میں سے گزر کر پہلے ہم سام گڑھ جائیں گے۔ وہاں سے بھابھور کا بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ بس یہی ایک راستہ تھوڑا بہت محفوظ رہ گیا ہے۔ یہاں بھی دونوں طرف کی فوجی گشت جاری رہتی ہے۔"

فیروز بھائی نے مجھ سے پوچھا۔

"خیردین نے جو کچھ کہا ہے تم نے سن لیا ہو گا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ پاکستان میں داخل ہونا اتنا آسان نہیں ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہو؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں فیروز بھائی۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔"

رات کے پچھلے پہر ہم ایک ویگن میں بیٹھ کر جودھ پور سے جیسلمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہر طرف صحرائی ٹیلے تھے۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ صحرا میں رات کو اتنا اندھیرا نہیں ہوتا۔ ویگن ریتلے راستے پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سفر بہت طویل تھا۔ ساری رات ہم سفر کرتے رہے۔ راستے میں ایک

جگہ ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ اس کے بعد پھر روانہ ہو گئے۔ دوسری رات بھی سفر میں گزر گئی۔ تیسرے دن ہم جیسلمیر پہنچ گئے۔ فیروز بھائی اور خیردین کی یہاں کچھ سمگلروں سے بڑی دوستی تھی۔ ہم ان کے ہاں جا ٹھہرے۔ یہاں سے فیروز بھائی مجھے ان کے حوالے کر کے واپس بمبئی چلا گیا۔

اب ہمیں سام گڑھ جانا تھا۔ جہاں سے آگے بھابھور کے مقام سے مجھے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونا تھا۔ سارا دن میں ان لوگوں کی کمین گاہ میں چھپا رہا۔ یہ کمین گاہ جیسلمیر کے چھوٹے سے قصبہ نما شہر سے باہر صحرائی ٹیلوں میں ایک خفیہ جگہ پر واقع تھی۔ جب رات ہو گئی تو ایک سمگلر ہمارے ساتھ ہو گیا۔ ہم پیدل ٹیلوں میں سام گڑھ کی طرف چل پڑے۔ سام گڑھ سے ہم دو اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ یہان سے بھابھور بارڈر کافی دور تھا۔ ہم ساری رات اونٹوں پر صحرائی ٹیلوں کے درمیان آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔

صبح ہوئی تو میں نے دیکھکہ ہمارے چاروں جانب صحرا پھیلا ہوا تھا۔ صحرا میں کہیں کہیں ریت کے ٹیلے تھے۔ ہم نے ایک خفیہ جگہ قیام کیا۔ کیونکہ خیردین نے بتایا تھا کہ ہم رات کو بارڈر کراس کریں گے۔ بارڈر اب وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ جو سمگلر سام گڑھ سے چلا تھا وہ ہمیں آگے دو سمگلروں کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔ یہ سمگلر مجھے صحرائی ڈاکو لگتے تھے۔ خیردین نے بتایا کہ یہ دیہاتی لوگ ہیں مگر بڑے تجربہ کار آدمی ہیں۔ آج کل ان کی مجرمانہ سرگرمیاں بند ہو گئی ہیں لیکن یہ تمہیں بارڈر تک اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

میں نے پریشانی کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

"یہ لوگ بڑے اعتماد والے آدمی ہیں۔ یہ تمہیں بارڈر پار پہنچا کر ہی واپس آئیں گے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔ وہ سارا دن ہم نے ایک صحرائی ٹیلے کے غار میں گزارا۔ یہ صحرائی ٹیلہ پتھریلا تھا۔ صحرا میں کہیں ریت بھربھری تھی اور کہیں پتھر کی طرح سخت ہو جاتی تھی۔ ایسے علاقے سے دھوپ میں گزرتے ہوئے سخت گرمی محسوس ہوتی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے پتھریلے ٹیلے گرم ہو کر بھاپ خارج کرنے لگتے تھے۔ رات البتہ ٹھنڈی ہو جاتی اور ہمیں آگ کا ایک چھوٹا سا الاؤ روشن کرنا پڑتا تھا۔ میں دل میں خدا سے ہمہ وقت یہی دعا مانگتا کہ اے خدا مجھے کسی طرح پاکستان پہنچا دے۔ یہ مجھ پر تیرا بڑا کرم ہو گا۔

دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔ سمگلروں نے وہیں الاؤ روشن کر کے دو تین جنگلی مرغیاں بھون ڈالیں۔ سب نے مل کر روٹیوں کے ساتھ بھنا ہوا گوشت کھایا۔ اس کے بعد قہوہ تیار ہو گیا۔ خیر دین نے کہا۔

"قہوہ بے شک زیادہ پینا۔ اس سے نیند بھاگ جائے گی کیونکہ تم تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گے؟"

خیر دین بولا۔ "نہیں۔ یہاں سے میں اپنے دو دوست تمہارے ساتھ کر دوں گا وہ تمہیں پاکستان کے بارڈر تک چھوڑ کر واپس آ جائیں گے۔ تم اطمینان رکھو۔ جب تک تم بارڈر کراس نہیں کرو گے یہ لوگ وہیں رہیں گے۔"

یہاں سے خیر دین بھی میرا ساتھ چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اب میرے ساتھ صرف دو آدمی تھے۔ یہ دونوں ایک ایک اونٹ پر بیٹھے تھے۔ ایک اونٹ پر میں سوار تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ صحرائی راستہ خاموش اور ویران تھا۔ تینوں اونٹ صحرا میں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد صحرائی ٹیلوں کا جھرمٹ سا آ گیا۔ یہ بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اب ایک آدمی جو ہماری پارٹی کا

لیڈر تھا اور جس کو یہ لوگ ٹھاکر کہہ کر بلاتے تھے' اپنا اونٹ لے کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے بھی اپنے ساتھی کی طرح بندوق آگے رکھی ہوئی تھی۔ وہ راجستھانی لہجے میں اردو بولتا تھا۔

جب ہم صحرائی ٹیلوں کے اوپر سے گزر رہے تھے تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔

"بارڈر پار کرتے وقت کہیں گھبرا تو نہیں جاؤ گے؟ تم ناتجربہ کار ہو۔ دونوں ملکوں کے باڈر کے درمیان ایک خالی پٹی آتی ہے۔ ہم تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔ آگے تمہیں خود سرحد پار کرنی ہو گی۔ کیا تم ڈر تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"نہیں میں دوڑ کر پاکستان پہنچ جاؤں گا۔"

ٹھاکر ہنس پڑا۔ بولا۔

"اور اگر پیچھے سے گولی کمر میں لگ گئی تو نانی یاد آ جائے گی۔"

ہمارے پیچھے پیچھے جو ٹھاکر کا ساتھی اونٹ پر چلا آ رہا تھا وہ بھی ہنسنے لگا۔ بولا۔

"ٹھاکر! لگتا ہے یہ بابو زندہ پاکستان نہیں پہنچے گا۔"

ان کی اس قسم کی حوصلہ کمزور کر دینے والی باتوں سے میں مزید خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن اب میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ صحرا میں بڑی خاموشی اور آہستگی سے ہمارا سفر جاری تھا۔ لگتا تھا جیسے وقت رک گیا ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ ہم دائرے میں سفر کر رہے ہیں۔ جہاں سے چلتے چلتے ہم چکر لگا کر پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ سارے صحرائی ٹیلے ایک جیسے تھے۔ ایک ٹیلے کی اترائی اترتے تو اسی قسم کے دوسرے ٹیلے کی چڑھائی شروع ہو جاتی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ صحرائی آسمان پر نیلی روشنی کی جھلکیاں نمودار ہونے لگی تھیں کہ دور سے ایک ٹیلے پر عمارت سی نظر آئی۔ ٹھاکر نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ بھابھور کا پرانا قلعہ ہے۔ ہم یہاں جاکر آرام کریں گے۔"

تھوڑی بعد ہم قلعے کے سامنے پہنچ گئے۔ اونٹوں سے اتر پڑے۔ میری کمر اونٹ کی سواری کی وجہ سے درد کرنے لگی تھی۔ کبھی اونٹ پر نہیں بیٹھا تھا۔ سامنے بھابھور کے پرانے قلعے کے کھنڈر کا دیو ہیکل دروازہ تھا۔ دروازے کی محرابیں منہ کھولے ہماری طرف جیسے جھک کر دیکھ رہی تھیں۔ قلعے کے اندر ایک صحن تھا۔ اس وقت تک صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تھی۔ صحن میں جگہ جگہ پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان پتھروں میں خشک گھاس اگی ہوئی تھی۔ صحن کی تینوں جانب ستونوں والا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کسی کوٹھری کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ ہم نے ایک کوٹھری میں ڈیرہ جمالیا۔ باہر آگ روشن کر دی گئی۔ کھانے کو یہ لوگ جوار کی روٹیاں اور گڑ ساتھ لے کر چلے تھے۔ پانی کی چار چھاگلیں بھی تھیں۔ ہم نے گڑ کے ساتھ روٹی کھائی۔ کیتلی میں چائے بنائی گئی۔ اتنی دیر میں صبح ہو گئی۔ ٹھاکر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"دینو! ذرا جاکر معلوم کرو۔ آگے کیا معاملہ ہے۔"

دینو سمگلر اسی وقت اونٹ پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں اور ٹھاکر کوٹھڑی میں جاکر بیٹھ گئے۔ آگ بجھادی گئی تھی تاکہ دن کے وقت اس کا دھواں دور سے نظر نہ آجائے۔ ٹھاکر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ مسلمان تھا مگر اسے ٹھاکر کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ میں نے ٹھاکر سے کہا۔

"آپ لوگ انڈیا سے کیا لے کر پاکستان جاتے ہیں اور وہاں سے کیا لے کر واپس آتے ہیں؟"

وہ بولا: "بس جو چیز ادھر سستی ہے اور پاکستان میں مہنگی ہے وہی چیز لے کر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا: "آپ لوگ تھوڑے سے منافع کی خاطر اپنی جان اتنے بڑے خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں۔"

ٹھاکر ہنسنے لگا۔ بندوق ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ہمارا جدی پشتی یہی پیشہ ہے۔ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام کرتے آئے ہیں۔ دوسرا کوئی کام ہمیں آتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا: "یہ کام تو خلاف قانون بھی ہے۔ تم لوگ کسی بھی وقت پکڑے جاسکتے ہیں۔"

ٹھاکر بولا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ جب سے پاکستان بنا ہے' دل اس کام سے اکھڑ گیا ہے۔ پاکستان سے ہمیں محبت ہے۔ یہ مسلمانوں کا ملک ہے۔ اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اسی لئے میں منشیات لے کر کبھی یہاں سے پاکستان نہیں گیا۔ بس الائچیاں وغیرہ لے جاتا ہوں جو پاکستان میں مہنگی ہیں۔ ہمارے گروہ کا ایک بھی آدمی انڈیا سے شراب وغیرہ لے کر کبھی نہیں گیا۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے وقت گزر گیا۔ دھوپ قلعے کے صحن میں آگئی تھی۔ رات کو ٹھنڈ تھی مگر اب گرمی شروع ہو گئی تھی۔ اتنے میں دینو واپس آگیا۔ کہنے لگا۔

"ٹھاکر' ادھر معاملہ خراب لگتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

دینو ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ بیڑی سلگا کر بولا۔

"بھابھور کے بارڈر پر پاکستانی فوج کی گاڑیاں گشت لگا رہی ہیں۔ سندھ کے بہادر حر بھی اونٹوں پر گشت لگاتے مجھے نظر آئے تھے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ اس بابو کو کہاں سے سرحد پار کرانا ہے۔"

ٹھاکر خاموش تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بھابھور کے پرانے ناکے پر بھی تم گئے تھے؟"

وہ بولا:۔ "ہاں۔ میں ادھر کا بھی چکر لگا کر آیا ہوں۔ وہاں بھی خطرہ منڈلا رہا ہے۔"

مجھ پر ایک بار پھر مایوسی کے بادل چھانے لگے۔ سوچنے لگا کہ اگر یہاں سے بھی پاکستان نہ جا سکا تو پھر میرا پاکستان پہنچنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ٹھاکر نے اپنی پگڑی اتار کر گود میں رکھی۔ سر کھجانے لگا۔ پھر دینو سے کہا۔

"ابے ایسی کونسی بات ہو گئی ہے۔ دیکھا جائے گا۔ ہم آج رات بھابھور کے پرانے ناکے سے ہی سرحد کراس کریں گے۔"

مجھے یاد آ گیا۔ خیر دین نے کہا تھا کہ یہ لوگ مجھے انڈیا اور پاکستان کی سرحد کے درمیان جو خالی پٹی ہے یہ لوگ مجھے وہاں چھوڑ کر واپس آ جائیں گے۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے ٹھاکر سے کہا۔

"ٹھاکر جی! آپ مجھے پاکستان کی سرحد کے اندر تک پہنچا دیں گے ناں؟"

ٹھاکر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی۔ ہم پاکستان کی سرحد کے اندر نہیں جائیں گے۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ ہم تمہیں دونوں بارڈروں کے درمیان جو خالی جگہ ہے وہاں پہنچا کر واپس آ جائیں گے۔ آگے تم خود بارڈر کراس کر کے پاکستان جاؤ گے۔"

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو بڑا خطرہ ہو گا۔ دونوں طرف کی فوجوں کے مورچے ہوں گے۔ فوجی گاڑیاں بھی گشت کر رہی ہوں گی۔"

دینو کہنے لگا۔

"تو پھر کیا ہوا۔ پاکستانی فوج والے تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ دوڑ کر ان کے مورچوں میں چلے جانا۔ کہہ دینا کہ میں پاکستانی ہوں۔ مسلمان ہوں۔ وہ گولی نہیں چلائیں گے۔"

ٹھاکر نے دینو کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بس اتنا ضرور کرنا کہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے رکھنا اور اونچی آواز میں کہتے جانا کہ میں پاکستانی ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

میں نے کہا:۔ "کیا انڈیا کے فوجی اپنے مورچوں سے مجھ پر فائرنگ تو شروع نہیں کر دیں گے۔"

ٹھاکر بولا:۔ "بھائی اب اسکی ہم ضمانت نہیں دیتے۔ یہ خطرہ تو تمہیں مول لینا ہی پڑے گا۔ اگر تیار ہو تو آگے چلو۔ نہیں تو یہیں سے ہمارے ساتھ واپس پلٹ چلو۔ ہم تمہارے واسطے اپنی جان قربان نہیں کر سکتے۔ ابھی وقت ہے سوچ لو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کروں؟ کیسے کروں؟ اس الجھن میں پڑ گیا تھا۔ ٹھاکر نے بندوق ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر نہیں جانا تو چلو واپس چلتے ہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں ٹھاکر جی! آپ مجھے پاکستان کی سرحد کے سامنے چھوڑیں۔ آگے جو میری قسمت میں ہو گا میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

ٹھاکر نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاباش! تم بڑے بہادر لڑکے ہو۔ خدا نے چاہا تو تم پاکستان پہنچ جاؤ گے"۔

رات ہو گئی تو ٹھاکر نے دینو کو وہیں قلعے میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور مجھے اپنے اونٹ کے پیچھے بٹھا لیا۔ خود میرے آگے اونٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ ایسا اونٹ تھا جس کے دو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوہان تھے۔ ہم رات کی تاریکی میں بھابھور کے ناکے والے باڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بندوق ٹھاکر نے کجاوے کے ساتھ لٹکا رکھی تھی۔ پانی کی صرف ایک چھاگل ہمارے ساتھ تھی۔ روٹی ہم قلعے سے کھا کر روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت یونہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ میری زندگی کا آخری کھانا ہو۔ ریت کے خاموش ویران صحرا میں ستاروں کی دھندلی روشنی میں ہمارا اونٹ آہستہ آہستہ ایک سمت کو چلا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے ہم کوئی دو تین گھنٹے تک چلتے رہے۔۔۔ اس کے بعد ٹھاکر جو میرے آگے اونٹ پر بیٹھا ہوا تھا' کہنے لگا۔

"یہاں سے پاکستان انڈیا کا بارڈر زیادہ دور نہیں ہے۔ آدھ گھنٹے میں ہم انڈیا کے بارڈر کو کراس کر جائیں گے۔"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ اونٹ ایک نپی تلی رفتار کے ساتھ رات کے اندھیرے میں صحرا میں چلا جا رہا تھا۔ ہم اوپر نیچے ہل رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر دور سے روشنی سی چمک کر بجھ گئی۔ ٹھاکر نے اونٹ کو یکدم وہیں روک لیا۔ کہنے لگا۔

"معاملہ گڑبڑ ہے۔ لگتا ہے انڈیا کی گشتی پارٹی آگئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی تڑاتڑ تڑاتڑ مشین گن کے فائر کی آواز آئی۔ ٹھاکر نے وہیں سے اونٹ کو پیچھے کی جانب موڑا اور اسے تیز تیز چلانے لگا۔ اونٹ اب دوڑ رہا تھا۔ آگے ایک ٹیلہ آگیا۔ ٹیلے کے پیچھے آکر ٹھاکر نے اونٹ روک دیا۔ پھر اسے بٹھا دیا۔ کہنے لگا۔

"بابو! وہ سامنے چھوٹا ٹیلہ دیکھ رہے ہو؟"

مغرب کی جانب ایک چھوٹا ٹیلہ اندھیرے میں کالا کالا نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"وہاں کیا ہے؟"

ٹھاکر بولا: "بس یہ سمجھ لو کہ اس کے پیچھے پاکستان شروع ہو جاتا ہے۔ تمہارا کام ہے کہ اب یہیں اتر جاؤ اور جتنی تیز چل سکتے ہو چل کر ٹیلے کی دوسری طرف نکل جاؤ۔ تم پاکستان پہنچ جاؤ گے۔ مجھے یہاں سے واپس جانا ہو گا۔"

میں گھبرا گیا۔ یہ شخص مجھے عین خطرے کے درمیان اکیلا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"ادھر تو فائرنگ کی آواز آئی تھی۔ انڈین فوج وہاں ضرور موجود ہو گی۔"

ٹھاکر نے کہا۔ "فضول بحث مت کر۔ نہ زیادہ دیر کرو۔ تمہیں کہہ دیا ہے کہ سامنے والے ٹیلے کے پیچھے پاکستان شروع ہو جاتا ہے۔ بس جلدی سے ادھر چلے جاؤ۔"

یہ کہہ کر ٹھاکر نے مجھے اونٹ سے نیچے اتار دیا۔ جیسے ہی میں اترا' ٹھاکر نے اونٹ کی کمر پر ہاتھ مارا۔ اونٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھاکر نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ کوئی بات بھی نہ کی اور اونٹ کو لے کر تیز تیز چلاتا پیچھے کی طرف چل دیا۔ میں وہاں کھڑا اسے تکتا ہی رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں صحرا کی ویران رات میں اکیلا کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آگے جاؤں یا میں بھی پیچھے کی طرف بھاگ جاؤں۔

رات ساکن تھی۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ مجھے اس خاموشی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے اس طرف دیکھا جس طرف سے روشنی چمکی تھی اور مشین گن کی فائرنگ ہوئی تھی۔ اس طرف اب سکوت چھا گیا تھا۔ میں نے کچھ فاصلے پر اس ٹیلے کی طرف دیکھا جس کی دوسری جانب ٹھاکر کے کہنے کے مطابق پاکستان شروع ہو جاتا تھا۔ دل نے کہا: اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔ پیچھے جاؤ گے تو وہاں بھی قدم قدم پر موت منہ کھولے کھڑی ملے گی۔ بھارتی پولیس کا ٹارچر ہو گا۔ جیل کی کوٹھڑیوں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہمت سے کام لو اور ہلہ بول کر پاکستان کا بارڈر کراس کر جاؤ۔

میں نے ٹیلے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہاں ریت میرے پاؤں کے نیچے بھربھری نہیں تھی۔ جیسے جیسے ٹیلہ قریب آتا گیا۔ ریت بھربھری ہوتی گئی۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں اس کے پاس جاکر رک گیا۔ آہستہ آہستہ چل کر ٹیلے کی دوسری جانب دیکھا۔ سامنے صحرا میں دور اندھیرے میں جھاڑیاں نظر آئیں۔ میں ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ بنا ہی رہا تھا کہ بائیں جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ فائرنگ کی آواز وقفے وقفے سے آتی رہی۔ پھر یہ آواز قریب ہونے لگی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بھارتی فوج کی کوئی پٹرول پارٹی ہے جس کو شک ہو گیا ہے کہ یہاں سے سمگلر بارڈر کراس کر رہے ہیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ مجھے ایک طرف سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی نظر آئی۔ میں وہیں ریت پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ مجھ سے کوئی سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر سے ایک جیپ تیزی سے گزر گئی۔ اس جیپ کی مشین گن دو دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد برسٹ فائر کر رہی تھی۔

یقیناً یہ انڈین فوج کی جیپ تھی۔ جیپ آگے نکل گئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ مجھے بھارتی فوجی چاروں طرف سے گھیر لیں گیں اور ہو سکتا ہے گرفتار کرنے کی بجائے اسی جگہ گولی سے اڑا دیں۔ اتنے میں پیچھے سے ایک اور گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس گاڑی کی مشین گن بھی برسٹ فائر کر رہی تھی۔ میں وہاں لیٹنے کی بجائے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگنے لگا۔ میں نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ بھربھری ریت پر زیادہ بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ دور جا کر زمین سخت ہوئی تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کافی دور نکل گیا تھا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ آگے دوڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہیں ہانپتا ہوا بیٹھ

گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی دم نکل جائے گا۔ میں بالکل چت لیٹ گیا۔ اس طرح کچھ آسانی بھی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا اور خوف زدہ نظروں سے صحرا میں اس طرف دیکھا جدھر سے بھارتی فوج کی گاڑیاں فائرنگ کرتی گزری تھیں۔ وہاں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر میرے لئے اس طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سخت مایوسی کے عالم میں اٹھا اور واپس چل پڑا۔

میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ سخت پیاس لگنے لگی تھی۔ مگر دور تک صحرا ہی صحرا تھا۔ وہاں مجھے پانی کہاں سے مل سکتا تھا۔ پانی کی چھاگل بھی ٹھاکر اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ تھک جاتا تو تھوڑی دیر بیٹھ کر دم لیتا۔ اس کے بعد پھر چلنے لگتا۔ اب ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے پاؤں ریت میں دھنسنے لگے۔ تھوڑی دور چل کر ہی تھک جاتا اور بیٹھ جاتا۔

اس طرح کبھی چلتے اور کبھی بیٹھ کر سانس لیتے رات گزرتی چلی گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ابھی صبح کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ستارے اسی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ خدا جانے میں کتنی دیر چلا ہوں گا۔ ایک مقام پر مجھے آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ ہوا بند تھی۔ میں نے آواز پر کان لگا دیئے۔ یہ آواز دور سے آرہی تھی۔ لگتا تھا کوئی عورت گا رہی تھی۔ ساتھ ڈھولک بھی بج رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر اس سمت چلنے لگا کہ شاید وہاں کوئی گاؤں ہو گا۔ وہاں مجھے پینے کو پانی ضرور مل جائے گا کیونکہ اب پیاس نے سارے حلق کو خشک کر دیا تھا۔ ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا تو کچھ فاصلے پر مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ آگ کے الاؤ کی روشنی تھی۔ کسی نے آگ کا الاؤ روشن کر رکھا تھا۔

عورت کے گانے کی آواز اب زیادہ قریب ہو گئی تھی۔ میرے اندر جیسے نئی طاقت آگئی۔ میں الاؤ کی طرف جتنا تیز چل سکتا تھا چلنے لگا۔ پھر بھی مجھے کافی وقت لگ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ آگ کا الاؤ کبھی دور ہو جاتا اور کبھی قریب دکھائی دینے لگتا۔ آخر میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں آگ کا چھوٹا سا الاؤ روشن تھا۔ میں نے دیکھا کہ تین چار اونٹ بیٹھے تھے۔ ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ خیمے کے سامنے آگ روشن تھی۔ کچھ آدمی الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ ایک عورت رقص کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوئی گیت بھی گا رہی تھی۔ یہ منظر مجھے کسی خواب کا منظر لگا۔

میں زیادہ قریب آ گیا تھا۔ عورت نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ الاؤ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی تو اس کے کانوں اور گلے کے چاندی کے زیور چمک اٹھتے۔ اب ان لوگوں نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ ایکدم سے رقص رک گیا۔ دو آدمی اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔ میں تھکن سے چور ہو کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ جھک کر مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پانی۔"

انہوں نے اپنی زبان میں پیچھے آواز دی۔ وہی عورت جو رقص کر رہی تھی۔ جلدی سے ایک پیالے میں پانی ڈال کر لے آئی۔ میں نے پیالہ اپنے خشک ہونٹوں سے لگا لیا۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں سارا پانی پی گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی کھیت برسوں کا سوکھا پڑا ہو اور ایکدم اس پر بارش کا پانی برسنے لگا ہو۔ میں نڈھال تھا۔ ایک آدمی نے کہا۔

"اس کو اندر لے چلو۔"

دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور خیمے میں لے گئے۔ خیمے میں زمین پر کالے رنگ کا کمبل بچھا تھا۔ ایک آدمی زور زور سے میرے پاؤں پر ہاتھ ملنے لگا۔ اندر تیل کا لیمپ پہلے سے روشن تھا۔ رقص کرنے والی عورت اور تین چار مرد میرے قریب ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا۔ ان سب نے بڑے بڑے

پگڑ باندھے ہوئے تھے۔ ان کا لباس راجستھان کے خانہ بدوشوں والا تھا۔ اس قسم کے خانہ بدوشوں کو میں نے فلموں میں دیکھا ہوا تھا۔ بوڑھے خانہ بدوش نے پوچھا۔

"کون ہو بھیا! تم ادھر کیسے آ گئے؟"

میں نے انہیں اصل حقیقت تو نہ بتائی۔ یہی کہہ دیا کہ اس طرف اپنے دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ دوست سے بچھڑ کر راستہ بھول گیا۔ یہ بڑے اچھے لوگ تھے۔ بڑے سادہ دل انسان تھے۔ انہوں نے جھونپڑی میں مجھے بستر لگا کر لٹا دیا۔ میں نے سوچا کہ کسی طرح یہاں رات بسر کرنی چاہیے۔ صبح ہو گی تو راستہ پوچھ کر کسی قریبی گاؤں میں چلا جاؤں گا اور وہاں سے واپس بمبئی پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میری جیب میں چھ سات روپے ہی رہ گئے تھے۔ میں نے بوڑھے خانہ بدوش کو پانچ روپے نکال کر دینا چاہے مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا۔

"بھائی تم ہمارے مہمان ہو۔ مہمانوں کی خدمت کر کے کوئی پیسے تو نہیں لیتا۔"

ڈانس کرنے والی لڑکی کا نام رمکلی تھا۔ وہ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ رات کو بڑے مزے کی نیند آئی۔ اس اعتبار سے بھی دل مطمئن ہو گیا تھا کہ اب راجستھان کی طرف سے بلکہ جموں کشمیر کی طرف سے پاکستان جانے کی کوشش کروں گا۔ بارڈر فورس والوں سے بھی بچ گیا تھا۔ ساری رات گہری نیند سویا رہا۔ صبح اس وقت اٹھا جب دھوپ چاروں طرف کھلی ہوئی تھی۔ آدمی کسی جھاڑیوں کی شاخوں کو جوڑ کر پنکھے اور صفیں بنا رہے تھے۔ دو پکی عمر کی عورتیں بھی تھیں۔ وہ کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ رقص کرنے والی لڑکی جس کا نام رام کلی ہو گا ایک طرف بیٹھی چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ میں خیمے سے باہر نکل آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ پھر شرما کر روٹیاں پکانے میں مصروف ہو گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بوڑھے خانہ بدوش نے مجھے کہا۔

"بھیا وہ پانی کا لوٹا لے لو اور ادھر جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ۔"

اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر جوار کی روٹی اچار اور کڑوی چائے کا ناشتہ کیا۔ چائے میں بکری کا دودھ برائے نام ڈالا گیا تھا۔ رام کلی میرے لئے بکری کا دودھ الگ دھو کر لے آئی۔ پیالہ میری طرف بڑھا کر بولی۔

"یہ لو۔ یہ پی لو۔"

میں نے کہا: "نہیں۔ میں نے چائے پی لی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اسکی ماں نے دور سے آواز دی۔

"پی لو بیٹا۔ یہ ہماری رسم ہے۔ جب کوئی مہمان ہمارے ہاں آتا ہے' تو ہم اسے بکری کا دودھ ضرور پلاتے ہیں۔"

میں نے دودھ پی لیا۔ بوڑھا خانہ بدوش اور اسکا ساتھی منگو میرے پاس بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔

"بھیا ہم تو آگے چلے جائیں گے۔ دھوپ زیادہ نکلے گی تو چل پڑیں گے۔ تم بتاؤ تمہیں کہاں جانا ہے۔"

میں نے کہا: "بابا! مجھے کسی قریبی گاؤں یا شہر کا راستہ بتا دینا۔ میں وہاں سے جودھ پور چلا جاؤں گا۔ پھر وہاں سے بمبئی چلا جاؤں گا۔"

منگو کہنے لگا: "آگے تو کوئی گاؤں نہیں ہے۔ جودھ پور بڑا پیچھے رہ گیا ہے۔"

میں نے ان سے پوچھا: "آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

بوڑھے نے کہا۔

"ہم تو خانہ بدوش ہیں بھیا۔ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ہم پنکھے صفیں بیچتے کبھی کسی قصبے دیہات کا رخ کر لیتے ہیں۔ ورنہ اس صحرا میں چلتے پھرتے رہتے ہیں۔"

منگو کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔ دس پندرہ دنوں کے بعد ہمیں بیکانیر کی طرف سے ایک بڑے قصبے میں جانا ہے۔ وہاں تم آگے چلے جانا۔"

میرے سامنے اسکے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ہی اس اجاڑ صحرا میں سفر کرتا رہوں جب تک کہ وہ کسی بڑے شہر یا قصبے کے قریب نہیں پہنچا دیتے۔ ان سے الگ ہو کر اس خطرناک علاقے میں سفر کرنا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے ان کی تجویز قبول کر لی۔ ان کے بارے میں تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ مگر انہوں نے ابھی مجھ سے میرے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھا تھا کہ میں ہندو ہوں عیسائی ہوں یا مسلمان ہوں۔

جب دھوپ ذرا تیز ہو گئی تو انہوں نے خیمہ اکھاڑ کر لپیٹا۔ دوسرے سامان کے ساتھ اسے بھی ایک اونٹ پر لادا۔ عورتیں دو ڈاچیوں پر بیٹھ گئیں۔ ایک اونٹ پر میں اور خانہ بدوش سوار ہو گئے۔ اور ہمارا قافلہ صحرا میں ایک طرف چل پڑا۔ سارا دن ہم صحرا میں سفر کرتے رہے۔ دھوپ بڑی تیز تھی مگر ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو قافلے نے نخلستان میں ایک جگہ ڈیرہ جما لیا۔ یہاں ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ کچھ درخت بھی تھے۔ دو خیمے لگا دیئے گئے۔ آگ روشن ہو گئی۔ ایک آدمی صحرا میں کہیں سے ہرن مار کر لے آیا۔ اسے الاؤ پر ڈال کر بھونا جانے لگا۔ رات کا اندھیرا چھا گیا تو خیمے کے باہر لالٹین روشن کر دی گئی۔ ایک جوان خانہ بدوش کلہاڑی لے کر ٹیلے کی طرف گیا اور بہت سی خشک لکڑیاں اور جھاڑیاں جلانے کے واسطے لے آیا۔ رات کو سب نے مل کر کھانا کھایا۔ انہوں نے دیسی شراب بھی تھوڑی پی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے بعد الاؤ کے گرد محفل جم گئی۔ ایک لڑکا کوئی ساز اور دوسرا آدمی ڈھولک لے کر بیٹھ گیا۔ وہی لڑکی رمکلیا کمر کے گرد دوپٹہ باندھ کر چاندی کا زیور پہن کر آ گئی۔ ڈھولک بجنے لگا۔ ایک عورت نے کوئی گیت گانا شروع کر دیا۔ رمکلیا رقص کرنے لگی۔

ایک بار پھر وہاں خواب ایسی حالت طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ہم دنیا کی اولیں جنگلی تہذیب کلچر کے لوگ ہیں۔ ابھی دنیا نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ساری زمین پر سوائے صحرا کے اور کچھ نہیں ہے۔ عورت کی آواز میں بڑا درد اور سرور تھا۔ میں بوڑھے خانہ بدوش کے پاس بیٹھا تھا اور رمکلیا کو گیت کے بولوں پر دیوانہ وار رقص کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں کوئی گھنگھرو نہیں تھے۔ مگر وہ سانپ کی طرح بل کھا کھا کر رقص کر رہی تھی۔ کبھی رقص کرتے کرتے آگے کو جھک کر جیسے کسی کی تعظیم کرتی۔ پھر اچانک سر اٹھا کر یوں پیچھے ہٹ جاتی جیسے کسی چیز کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی ہو۔ پھر ڈھولک کی لے پر گردش کرنے لگتی جیسے زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ ستارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ الاؤ کی روشنی میں اسکے چہرے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

دیر تک یہ رقص و سرود کی معصوم اور سادہ محفل جاری رہی۔ کچھ دیر بعد سب اپنی اپنی جگہ سونے کے واسطے چلے گئے۔ میرا خیال ہے میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے قریب سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے رائفل کے فائر کی آواز سنی۔ آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ سارے خانہ بدوش فائر کی آواز سن کر جاگ پڑے تھے۔ بوڑھا خانہ بدوش ایک طرف اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"لگتا ہے بارڈر پر پھر جنگ شروع ہو گئی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ جنگ شروع نہیں ہوئی بلکہ باڈر سیکورٹی فورس کے سپاہی میری تلاش میں اس طرف چلے آ رہے ہیں۔ جب فائرنگ کی آوازیں بہت قریب آ گئیں تو میں نے وہی کیا جو مجھے اس وقت کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بوڑھے خانہ بدوش سے بڑی عاجزی سے کہا۔

"بابا! یہ فوج کے آدمی میری تلاش میں ادھر آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچا لو۔ میں کون ہوں اور یہ فوجی میرے پیچھے کیوں لگے ہیں یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ صرف اتنا ضرور بتا دیتا ہوں کہ میں کوئی سمگلر، ڈاکو، چور یا کوئی قاتل نہیں ہوں۔ اس وقت مجھے کہیں چھپا لیں اور فوجی اگر یہاں آئیں تو انہیں میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔"

بوڑھے خانہ بدوش نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھے کیکر کے درختوں کے پاس لے گیا۔ بوڑھا خانہ بدوش اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ کیکر کے درختوں کے جھنڈ میں ایک طرف ٹیلے کی دیوار میں اندر کو ایک شگاف سا بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے وہاں چھپا کر آگے جھاڑیوں کی شاخیں توڑ کر ڈال دیں اور کہا۔

"جب تک میں نہ کہوں یہاں سے باہر نہ نکلنا۔"

میں کھوہ میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے خانہ بدوشوں کے خیمے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ ان خیموں کے پیچھے سے کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس نظر آئیں۔ یہ روشنی قریب آ رہی تھی۔ اس کے بعد جیپ کے انجن کی بھی آواز آنے لگی۔ جیپ خیموں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیپ میں سے چند فوجی اترتے دکھائی دیئے۔ خانہ بدوش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بوڑھا آدمی اور دوسرے آدمی ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ فوجی ان سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ مگر مجھے صاف سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے بارے میں ہی پوچھ رہے ہوں گے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ تین فوجی جیپ کے پاس ہی کھڑے رہے اور دو فوجی خیمے کی تلاشی لینے لگے۔ کیکر کے جھنڈ کی طرف کوئی نہ آیا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر سارے فوجی جیپ میں سوار ہو کر واپس چلے گئے۔

جب ان کی جیپ صحرا میں کافی دور نکل گئی تو بوڑھا خانہ بدوش میرے پاس آیا۔

"باہر آ جاؤ۔ وہ چلے گئے ہیں۔"

میں خیمے کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ لالٹین جل رہی تھی۔ بوڑھے خانہ بدوش نے کہا۔

"وہ لوگ تمہاری تلاش میں تھے۔ کہہ رہے تھے ایک پاکستانی جاسوس جیل توڑ کر فرار ہوا ہے۔ وہ بارڈر کراس کرنے کی کوشش کرے گا۔ نظر آ جائے تو اسے ہمارے پاس لے آنا۔"

میں نے کہا۔

"بابا! میں پاکستانی ضرور ہوں مگر جاسوس نہیں ہوں۔ میں اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے ساتھ ڈھاکہ میں رہتا تھا۔ ڈھاکہ میں مکتی باہنی والوں نے پنجابیوں بہاریوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ میرے خاندان کے سارے لوگ قتل ہو گئے۔ میں کسی طرح جان بچا کر بھاگ آیا۔ بڑی مشکل سے انڈیا کا بارڈر کراس کر کے کلکتے پہنچا۔ وہاں سے بمبئی چلا آیا کہ شاید یہاں سے کسی سمندری جہاز میں بیٹھ کر پاکستان جانے کا موقع مل جائے۔ معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے۔ مجھے بارڈر کراس کرانے کے لئے یہاں لایا گیا لیکن بارڈر پر مجھے اکیلا چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس کے بعد میں پریشان حال بھوکا

پیاسا صحرا میں پھر رہا تھا کہ آپ جیسے مہربان لوگ مل گئے۔ بس یہ ہے میری کہانی۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے مجھے کسی نزدیکی شہر میں پہنچا دیں' چاہے بھارتی فوج کے حوالے کر دیں۔"

ان لوگوں کے چہروں کو میں لالٹین کی دھیمی روشنی میں ساتھ ساتھ دیکھ بھی رہا تھا۔ میری باتوں کا ان پر بڑا اثر ہوا۔ بوڑھے نے کہا۔

"بھائی' ہماری نہ پاکستان سے کوئی دشمنی ہے نہ ہندوستان سے۔ ہمارا مذہب بھی ہندو مسلمانوں سے الگ ہے۔ ہم سورج اور صحرا کی پوجا کرتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ کسی قریبی شہر پہنچنا ہے تو وہ بھی کر دیں گے اور اگر پاکستان جانا چاہتے ہو تو پاکستان کی سرحد بھی پار کرا دیں گے۔"

میں نے خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بوڑھے خانہ بدوش سے کہا۔

"بابا! تم لوگ سچ مچ فرشتے ہو۔ لیکن تم مجھے پاکستان کیسے پہنچا سکتے ہو؟ بارڈر پر تو دونوں طرف کی فوجیں بیٹھی ہیں۔"

بوڑھے خانہ بدوش نے کہا۔

"میں تمہیں انڈیا کا بارڈر تو پار کرا سکتا ہوں۔ آگے پاکستان کا بارڈر پار کرنا تمہارا کام ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے صحرا کی کڑی دھوپ میں میں کسی ٹھنڈے پانی کے چشمے پر آ گیا ہوں۔ بوڑھے خانہ بدوش نے میرے دل میں امید کی نئی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہم صدیوں سے ان صحراؤں میں پھر رہے ہیں۔ صحرا کا کوئی راز ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہم ان خفیہ صحرائی راستوں کو بھی جانتے ہیں جن کا کسی دوسرے کو پتہ نہیں ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں بارڈر کراس کرا دیں گے۔"

وہ رات میں بڑی امید اور سکون کے ساتھ سویا رہا۔ دوسرے روز صبح صبح بوڑھے خانہ بدوش کے حکم سے خیمے اور دوسرا سامان سمیٹ کر اونٹوں پر لاد دیا گیا اور خانہ بدوشوں کا یہ مختصر قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔

بوڑھا کہنے لگا۔

"فوج نے ہماری جگہ دیکھ لی تھی۔ وہ دن کو بھی تمہیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف آ سکتے تھے' اسی لئے میں نے کوچ کا حکم دے دیا۔"

میں نے دبی زبان میں پوچھا کہ وہ مجھے کب اور کہاں سے انڈیا کا باڈر کراس کرائے گا۔ بوڑھا بولا۔

تمہیں صرف دو دن اور ہمارے ساتھ رہنا ہو گا۔ ہم اسی طرف جا رہے ہیں جہاں سے تمہیں سرحد کے پار پہنچانا ہے۔"

میں نے کہا:۔ "بابا! کیا وہاں بارڈر پر انڈیا کی فوج کے مورچے نہیں ہوں گے؟"

وہ کہنے لگا:۔ "جہاں میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہاں سوائے صحرائی سانپوں اور کالے زہریلے بچھوؤں کے اور کوئی مخلوق نہیں ہو گی۔"

میں دو دن ان مہربان خانہ بدوشوں کے ساتھ صحرا میں سفر کرتا رہا۔ اس کے بعد صحرا میں ایسا علاقہ شروع ہو گیا جہاں ریت کے ٹیلوں پر کہیں کہیں سبزہ اور جھاڑیاں بھی نظر آنے لگیں۔ اس علاقے سے ہم دوپہر کے وقت گزر گئے۔ آگے پھر صحرا کا ویران اور تپتا ہوا علاقہ شروع ہو گیا۔ بوڑھے خانہ بدوش نے کہا۔

"ہم سانپوں اور زہریلے بچھوؤں کے علاقے میں آ گئے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں اگر کوئی سانپ یا بچھو کاٹ لے تو ہمارے پاس ایک تیل ہے وہ ہم زخم کے اوپر لگا دیتے ہیں اور سارا زہر باہر آ جاتا ہے۔"

سہ پہر تک ہم چٹیل سنگلاخ قسم کے صحرا میں سے گزرتے رہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ بوڑھے خانہ بدوش نے وہاں ڈیرا لگانے کا حکم دیا۔ اونٹ کو بٹھایا خود بھی نیچے اترا۔ مجھے بھی اتارا اور کہنے لگا۔

"وہ سامنے جو ریت کے ٹیلے دیکھ رہے ہو' ان کی دوسری طرف پاکستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

میں بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ ان ٹیلوں کو دیکھنے لگا جن کی دوسری جانب میرا پیارا وطن' میری پناہ گاہ' ہماری عزتوں اور ہماری جان کا محافظ پاکستان آباد تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے ساتھ جانے لگا تو نہ جانے کیوں میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رمکلیا ایک اونٹنی پر سے سامان اتار رہی تھی اور وہ بھی عین اس وقت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اسی طرح مسکرائی پھر شرما کر نظریں جھکائیں اور اپنے کام میں لگ گئی۔ بوڑھا خانہ بدوش میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ ہم ٹیلوں کی طرف جا رہے تھے مگر وہ جیسے ہم سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سورج غروب ہونے کے قریب ہم ان ٹیلوں کے پاس پہنچ گئے۔ بوڑھا خانہ بدوش اب بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ وہ چند قدم چلتا۔ رک کر ارد گرد کا جائزہ لیتا اور دوسرے ٹیلے کی طرف چلنے لگتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم کئی ٹیلوں کے قریب سے گزر گئے۔ اتنی دیر میں رات ہو گئی۔ آسمان پر ستارے نکل آئے۔ بوڑھا خانہ بدوش ایک ایسے تنگ راستے پر آ گیا جو دو اونچے ٹیلوں کے درمیان تھا اور جہاں بہت سی جھاڑیاں اور خشک گھاس تھی۔ یہاں سے باہر نکل کر وہ بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"لو بھائی وہ سامنے تمہارا پاکستان ہے۔"

میں نے سامنے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک کھلا میدان تھا۔ اس کے آگے اندھیرے میں چند ایک درختوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ بوڑھے نے کہا۔

"وہ جو درخت ہیں' وہ پاکستان کے علاقے کے درخت ہیں۔ بس اب نکل جاؤ۔ وہاں پاکستان کے فوجی بیٹھے ہوں گے۔ وہ اگر تم پر گولی چلا دیں تو میں اسکی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے شکریہ ادا کرنے کا انتظار کئے بغیر واپس چل پڑا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کہیں یہ شخص بھی تو مجھے بیچ منجدھار میں نہیں چھوڑ گیا۔ میں سامنے والی کھلی جگہ میں نکلتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس طرف انڈیا کا بارڈر تھا۔ میں انڈیا کے بارڈر پر ہی تھا۔ مجھ پر کسی بھی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی۔ لیکن وہاں رکے رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں منزل کے کنارے پہنچ کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ سامنے والے درختوں کے خاکے میرے وطن کی سرزمین پر اگے ہوئے درخت تھے۔ وہ مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور چل پڑا۔

کھلی جگہ پر آتے ہی میں جھک کر چلنے لگا۔ تھوڑی دور ہی اس طرح چلنے سے میں تھک گیا۔ میں سیدھا ہو کر چلنے لگا۔ یقین کریں اس وقت میرے دل کی دھڑکن کی رفتار معمول کے مطابق نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کسی طرف سے مشین گن کا

برسٹ فائر ہو گا اور گولیاں میرے جسم کو چھلنی کرتی نکل جائیں گی۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ جیسے جیسے دور کے درختوں کا جھنڈ قریب آ رہا تھا میرے دل میں ایک نئی طاقت بیدار ہوتی جا رہی تھی۔ یہ طاقت اپنے پیارے وطن پاکستان کی سرزمین پر پہنچنے اور اپنے وطن کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی امید کی طاقت تھی۔ میں سخت ریتلی زمین پر سے گزر رہا تھا۔ پھر اپنے آپ ہی میری قدم تیز ہو گئے۔ درختوں کا جھنڈ اب کافی نزدیک آ گیا تھا۔ وہاں زمین اونچی تھی۔ جیسے ریل کی پٹڑی بچھانے کے لئے زمین اونچی کر دی جاتی ہے۔ میں دوڑنے لگا۔ جیسے ہی میں اونچے بند پر پہنچا تڑاتڑ مشین گن کا برسٹ فائر ہوا اور گولیاں میرے اوپر سے سیٹیاں بجاتی گزر گئیں۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ میرا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر آ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی سرچ لائیٹ کی روشنی مجھ پر پڑی اور کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"ہاتھ اٹھا لو۔ کون ہو تم؟"

کوئی گاڑی سٹارٹ ہوئی اور تیزی سے ایک طرف سے نکل کر میرے سر پر پہنچ گئی۔ یہ فوجی جیپ تھی۔ تین فوجی چھلانگیں لگا کر اترے اور انہوں نے مجھے حراست میں لے لیا۔

"کون ہو اوئے تم؟"

یہ پاکستانی فوج یا رینجرز کے جوان تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پنجابی میں کہا۔

"میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ہوں۔ بنگلہ دیش سے بھاگ کر آیا ہوں۔"

مجھے وہیں گرفتار کر لیا گیا۔ پیچھے ایک خیمے میں لے جایا گیا جہاں ایک فوجی افسر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور بارڈر کراس کرنے وہاں تک کیسے آ گیا ہوں۔ میں نے اس فوجی افسر کو ساری روداد بیان کر دی۔ وہاں سے مجھے پیچھے ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فوجی ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی مجھ سے پوچھ گچھ ہوئی۔ جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں سچ بول رہا ہوں اور میرے پاس سمگلنگ وغیرہ کا بھی کوئی سامان نہیں ہے تو مجھے مقامی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس مجھے لاہور لے آئی۔ یہاں آکر جب انہیں معلوم ہوا کہ میں واقعی اپنے کزن وغیرہ کو ڈھاکے سے نکالنے وہاں گیا تھا تو انہوں نے مجھے رہا کر دیا۔ میرے گھر والے مجھے دیکھ کر اتنا خوش ہوئے کہ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ وہ میری زندگی کی طرف سے بالکل نا امید ہو چکے تھے۔ میں اپنے گھر والوں سے ملنے کے بعد اپنے کزن فیاض اور شاہد بٹ کے گھر پہنچا۔

وہ لوگ بھی مجھے زندہ دیکھ کر حیران ہوئے اور خوش بھی۔ ان کی زبانی یہ مژدہ بھی سنا کہ فیاض اور شاہد بٹ کا نیپال سے دو روز پہلے ٹیلی فون آیا تھا کہ وہ نیپال پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور دو ایک روز میں براستہ کولمبو پاکستان پہنچنے والے ہیں۔ اسی روز میں وزیر آباد گیا۔ جمیلہ بہن نے مجھے اپنے گھر کا پتہ بتا دیا ہوا تھا جو مجھے یاد تھا۔ میں ان کے گھر گیا۔ جب جمیلہ کے ماں باپ کو بتایا کہ جمیلہ خیریت سے ہے اور کلکتہ میں ہمارے ایک عزیز کے گھر ایک بیٹی کی حیثیت سے رہ رہی ہے تو ان لوگوں کی بھی جان میں جان آئی۔ میں نے انہیں کہا۔

"آپ لوگ فکر نہ کریں۔ کلکتہ میں جمیلہ بہن ایسے رہ رہی ہیں جیسے اپنے گھر میں رہتی تھیں۔"

جب میں نے انہیں رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سنائے تو کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک ماہ بعد معلوم ہوا کہ جمیلہ بہن بھی وزیر آباد اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ آج اس واقعے کو اتنے برس گزر گئے

ہیں لیکن جب ان دنوں کا خیال آتا ہے تو مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ میں اس وقت وہاں سے جان بچا کر نکل آیا تھا جب ڈھاکہ جل رہا تھا۔

☆☆☆

THE END

www.iqbalkalmati.blogspot.com